



صَيْفِ رُوفَانٍ
حَاجَتْهُ سَهْلٌ

فَرَحَتْهُ حَسَابٌ

میں رونا چاہتا ہوں

فرحت احساس



سماہنیہ اکادمی

Main Rona Chahta Hoon : Selected poems of Farhat Ehsas
Compiled by the poet. Sahitya Akademi, New Delhi (2003). Rs. 50.

© ساہتیہ اکادمی

پہلا ایڈیشن : 2003ء

ساہتیہ اکادمی

ہبید آفس :

روئیندر جھون - 35 فیروز شاہ روڈ، نیو دہلی 110001

سیلز آفس :

اسوانی، مندر مارگ، نیو دہلی 110001

حلاقانی و فاتر :

جیون تارا جھون، 123/44 ایکس، ڈالمند بار بروڈ، کوکاتا 700053

172، ممبیٹی مراٹھی گرتھ سنگھر اے مارگ، داور، ممبیٹی 400014

سینٹل کالج کیمپس، ڈاکمری۔ آر۔ امبیدکر ویڈھی، بنگور 560001

آئی۔ آئی۔ آئی۔ کیمپس، آئی۔ آئی۔ آئی۔ آئی۔ پوسٹ، تارامنی، چینی 600013

قیمت : 50 روپے

ISBN 81-260-1593-4

Website : <http://www.sahitya-akademi.org>

طباعت : گلر پرنر، دہلی 110032

میری ناموزوں کا نقش لوٹا دے مجھے
اپنے آئینے سے میرا عکس لوٹا دے مجھے

از سر نو خواب کو آنکھوں سے وابستہ کروں
ساری تعبیرات کے برعکس لوٹا دے مجھے

اے شہر بتا کہاں گیا میں
مجھ کو مری یاد آرہی ہے

مجھ میں زندہ تھا مرادشت سو میں چھوٹ گیا
اور سب لوگ ابھی شہر کی تحویل میں ہیں

منی کا پکایا جانا ایک عذاب ہوا
جو جی میں ہو بن جانا خیال و خواب ہوا

تم دنیا کے باہر تھوڑی دیر رکو
میں اندر جھگڑا نمٹا کر آتا ہوں

دھیرے دھیرے درودیوار بڑے ہونے لگے
پھر اسے یاد نہ کرنے کے زمانے آئے

کوزہ گر

اے کوزہ گر!
 مری مٹی لے
 مر اپانی لے
 مجھے گوندھ ذرا
 مجھے چاک چڑھا
 مجھے رنگ برلنگے بر تن دے

جینے کی خوشبو

تیری یاد
 میرے گم صنم کانوں
 کے صدف میں
 لفظوں کے موتی لاتی ہے
 اور آنکھوں کے صحرائیں
 پانی کے باغ کھلا جاتی ہے
 تیرے کرم سے
 میرے خشک یتیم لبؤں پر
 دودھ کی بدلی چھا جاتی ہے
 اور مرے مردہ دل میں سے
 جینے کی خوشبو آتی ہے

اب دل کی طرف درد کی یلغار بہت ہے
 دنیا مرے زخموں کی طلب گار بہت ہے
 اب ٹوٹ رہا ہے مری ہستی کا تصور
 اس وقت مجھے تجھ سے سر و کار بہت ہے
 منی کی یہ دیوار کہیں ٹوٹ نہ جائے
 روکو کہ مرے خون کی رفتار بہت ہے
 ہر سانس اکھڑ جانے کی کوشش میں پریشان
 سینے میں کوئی ہے جو گرفتار بہت ہے
 پانی سے ابخت ہوئے انسان کا یہ شور
 اُس پار بھی ہو گا مگر اس پار بہت ہے

اس طرف تو تری یکتائی ہے
 اس طرف میں مری تنهائی ہے
 دو الگ لفظ نہیں بھرو وصال
 ایک میں ایک کی گویائی ہے
 ہے نشاں جنگ سے بھاگ آنے کا
 گھر مجھے باعث رسوانی ہے
 جس ہیں مشرق و مغرب دونوں
 اب نہ پچھوا ہے نہ پُردوانی ہے
 گھاس کی طرح پڑے ہیں ہم اوگ
 نہ بلندی ہے نہ گہرائی ہے
 جس بیابان میں ہوں میں آبلہ پا
 وہ بیابان مری سچائی ہے
 اس کی باتوں پر خفامت ہونا
 فرحت احساس تو سودائی ہے

(۱۹۸۳)

جسم کی کچھ اور ابھی مٹی نکال
 اور ابھی گھرائی سے پانی نکال
 اے خدا ! میری رگوں میں دوڑ جا
 شاخ دل پر اک ہری پتی نکال
 بھیج پھر سے اپنی آوازوں کا رزق
 پھر مرے صحراء سے اک بستی نکال
 مجھ سے ساحل کی محبت چھین لے
 میرے گھر کے پیچ اک ندی نکال
 میں سمندر کی تہوں میں قید ہوں
 میرے اندر سے کوئی کشتی نکال

(۱۹۷۶)

بیضہ نور

دور تک
 دور پھیلی ہوئی رات میں
 چاندنی میں نہایا ہوا
 ایک شیشے کا گھر
 بیضہ نور سا
 اس کے دیوار و در
 تیز جاں سوز خوشبو کے پر
 سبز پتوں سے تر
 سرخ گھرے گلابوں سے بھیکے ہوئے
 اوس کی نرم سانسوں میں سینچے ہوئے
 دور تک
 دور پھیلی ہوئی رات میں
 چاندنی کا یہ گھر
 صبح تک رات بھر
 میرا ایمان ہے
 میرا امکان ہے

شعر کہہ لینے کے بعد

جیسے تم کو چھولیا ہے

جیسے تم کو پالیا ہے

جیسے تم کو بول کر

چپ ہو گیا ہوں

ویسے یوں ہی

شعر کہہ لینے کے بعد

رات بھر میں دیکھتا ہوں

دور تک وہ ماہتاب

وہ گھنائھر اگلاب

(۱۹۷۶)

بازیافت

کل رات پچھلے پھر
 ہلکی سی آہٹ ہوئی
 پھر میں جاگ گیا یا
 کوئی خواب آنکھوں کے سامنے چلنے پھر نے لگا
 جانے کیا لفظ تھے کس کا شعر تھایا وہ
 میری ہی گم شدہ آواز تھی
 پلکوں، پیشانی، سینے اور بازوؤں پر
 ملائم ہو نٹھ اور
 نرم انگلیاں
 گرم سائیں اور ٹھنڈے آنسو
 ”وہ سب آگئے، وہ سب جانے والے
 لوٹ کر آگئے“

سمندر

لفظ بہت سے
 جگ جگ جگ کرتے تارے
 چاند نہیں بننے پاتے ہیں
 رات گلے میں پھنس جاتی ہے
 جذبے کتنے
 بورائی الہر خوشبوئیں
 پھول نہیں بننے پاتی ہیں
 ذات گلے میں پھنس جاتی ہے
 لیکن اکثر
 تیری یادیں
 تیرا چہرہ بن کر آئیں
 جگ جگ جگ کرتے تارے
 بورائی الہر خوشبوئیں
 چاند جلے رہتے ہیں شب بھر
 پھول کھلے رہتے ہیں شب بھر
 رات سمندر بن جاتی ہے
 ذات سمندر بن جاتی ہے

اُس طرف

انہیں ازل کی تسلیوں کے
رنگ کی تلاش نہیں
خدا کے چھوٹتے ہوئے
خدنگ کی تلاش نہیں
تو وہ

ہر اک محاورے کے اُس طرف چلے گئے
ز میں کے ہر معاشرے کے اُس طرف چلے گئے
وہاں جہاں سے جنگلوں کے راستے قریب تھے
وہاں جہاں سے زندگی کے حافظے قریب تھے

(۱۹۷۸)

مرے ثبوت بھے جا رہے ہیں پانی میں
کے گواہ بناؤں سرائے فانی میں
جو آنسوؤں میں نہاتے رہے سو پاک رہے
نماز ورنہ کے مل سکی جوانی میں
بھڑک اٹھے ہیں پھر آنکھوں میں آنسوؤں کے چراغ
پھر آج آگ لگادی گئی ہے پانی میں
ہمی تھے ایسے کہاں کے کہ اپنے گھر جاتے
بڑے بڑوں نے گزاری ہے بے مکانی میں
یہ بے کنار بدن کون پار کر پایا
بھے چلے گئے سب لوگ اس روائی میں
وصال و بھر کہ ایک اک چراغ تھے دونوں
سیاہ ہو کے رہے شب کی بے کرانی میں
بس ایک لمس کہ جل جائیں سب خس و خاشاک
اسے وصال بھی کہتے ہیں خوش بیانی میں
کہانی ختم ہوئی تب مجھے خیال آیا
ترے سوا بھی تو کردار تھے کہانی میں

وطن کو لوٹنا محال ہے

اُداسیوں کے شہر
 مجھ کو اپنی رونقوں میں غرق کرا!
 غرق کر
 کہ اپنے شجرہ نسب سے ٹوٹ کر
 میں ایک برگ بے اماں
 تری فراخ شہو توں میں کھوسکوں
 ترے و سمع زہر مرتبان میں
 میں اپنا آپ گھول دوں
 کہ اور جسم و روح فاصلہ بڑھے
 کہ اور میرا حافظہ قلیل ہو
 مری انا ذلیل ہو
 کہ اب
 وطن کو لوٹنا محال ہے

ایام صرف شام و سحر ہو کے رہ گئے
کیسے عجیب لوگ تھے گھر ہو کے رہ گئے
ہم کو پسند آگیا ساحل کا مشورہ
کشتی کی لکڑیاں تھے شجر ہو کے رہ گئے
مٹی کے اس مکان نے دھوکا دیا ہمیں
صرخا نور و خاک بسر ہو کے رہ گئے
آنکھیں جھپک کے رہ گئیں دل کی وفات پر
سیلا ب صرف دیدہ تر ہو کے رہ گئے
پہلے تو اپنے پاؤں زمیں سے جدا ہوئے
پھر یوں ہوا کہ شہر بدر ہو کے رہ گئے

(۱۹۷۸)

میں رونا چاہتا ہوں خوب رونا چاہتا ہوں میں
 اور اس کے بعد گھری نیند سونا چاہتا ہوں میں
 ترے ہونٹھوں کے صحرائیں تری آنکھوں کے جنگل میں
 جواب تک پاچکا ہوں اس کو کھونا چاہتا ہوں میں
 یہ کچھی میثیوں کا ڈھیر اپنے چاک پر رکھ لے
 تری رفتار کا ہم رقص ہونا چاہتا ہوں میں
 ترا ساحل نظر آنے سے پہلے اس سمندر میں
 ہوس کے سبب سفینوں کو ڈبوانا چاہتا ہوں میں
 کبھی تو فصل آئے گی جہاں میں میرے ہونے کی
 تری خاکِ بدن میں خود کو بونا چاہتا ہوں میں
 مرے سارے بدن پر دوریوں کی خاک بکھری ہے
 تمہارے ساتھ مل کر خود کو دھونا چاہتا ہوں میں

میری کوئی تعریف نہیں ہے میں وقفوں وقفوں میں ہوں
 جانے کن لمحوں میں نہیں ہوں جانے کن لمحوں میں ہوں
 باقی حصہ پڑا ہوا ہے جانے کس تاریکی میں
 میں بس اتنا ہی زندہ ہوں جس حد تک لفظوں میں ہوں
 سانسوں کا آنا جانا میرے ہونے کی دلیل نہیں
 دو سانسوں کے پیچ خلا کرنے والے لمحوں میں ہوں
 مدت گزری ایک عبادت میں فریاد گزاری تھی
 میں اپنی ہی ذات کے گھر میں ناجائز قبضوں میں ہوں
 وہ اسلوب کہاں سے حاصل ہو جو مجھ کو نظم کرے
 رزمیے کی ایک کتھا چھوٹی چھوٹی بھروں میں ہوں

میں تمام گردو غبار ہوں مجھے میری صورت حال دے
 مری خاک ہے کہ اڑی ہوئی اسے جسم کے خدوخال دے
 کہ نہ جانے کون مرے وجود پر پاؤں رکھ کے چلا گیا
 کوئی نقش پا ہے رکا ہوا سے راستے سے نکال دے
 میں کروں تو کیا کہ جنمے رہیں مرے پاؤں میری زمیں پر
 مرے گھر میں مجھ کو سنپھال یا مجھے میرے گھر سے نکال دے
 یہ فلک شگاف عمارتیں مرے آب و گل سے بچھڑ گئیں
 مرے آب و گل پہ کرم نہ کر تو عمارتوں کو زوال دے
 وہ ملاکہ جیسے بچھڑ گیا کوئی سانحہ بھی نہیں ہوا
 مرا عشق بھی کوئی عشق ہے کہ نہ خوش کرے نہ ملاں دے
 مرے ہونٹھ جانے کہاں گئے کہ تراہی نام نہ لے سکے
 مجھے حرف و صوت کے ماوراء کوئی اور خواب و خیال دے
 کوئی برف سی ہے جمی ہوئی مری چوٹیاں ہیں ڈھکی ہوئی
 مرا کوہسار طلوع ہو مرے پانیوں کو اباں دے

نگ دھرنگ ملنگ ترنسگ میں آئے گا جو وہی کام کریں گے
 کفر کریں گے جو آیا جی جی چاہا تو اسلام کریں گے
 راستے بھراں روپ کی دھوپ میں جان کھپائیں گے موت کی حد تک
 چلتے سے پھراں کی زلف کی چھاؤں میں بسراں کریں گے
 دیکھو تم اپنے کچے درودیوار کو پکا مت کروانا
 شہر میں جب بھی آئیں گے ہم تو تمہارے گھر ہی قیام کریں گے
 آج ہمارے سروں پر ہے یہ سورج پر کل خاک میں ہو گا
 ہم نے تو بس آواز لگادی باقی کام عوام کریں گے
 ایک اسی امید پے سارا تن من خاک کئے پھرتے ہیں
 تہبائی کا پہاڑ کئے گا جل ہو گا اشنان کریں گے
 ہم کو ایک بہت ہی بڑی سچائی کو افسانہ کرنا ہے
 خوب پیسیں گے شراب و ہم اور خوب خیال خام کریں گے
 عشق ہی پوری طرح کر لیں تو سمجھو کوئی جہاد کیا ہے
 یہ فرحت احساس ازل کے کابل کیا کوئی کام کریں گے

جب تک تمپش دل کی کسی قابل نہ ہو
 آب و ہوا کے کھیل میں شامل نہ ہو
 وہ کارروائی کی پشت پر ٹھہرا غبار
 وہ راستوں کے سیل کا ساحل نہ ہو
 یہ آنسوؤں کا حکم ہے گھر میں مرے
 کچھ میری وحشت کے سوا داخل نہ ہو
 تیار رکھو اور بھی آلات نور
 سورج نکلنے سے ذرا غافل نہ ہو
 وہ صح صادق یوں ابھرنے سے رہی
 جب تک کہ راتوں کا لکھا باطل نہ ہو
 یہ سوچ کراس کو کبھی دیکھا نہیں
 یہ رو برو ہونا بھی لا حاصل نہ ہو
 بینیخار ہوں کب تک یوں ہی بے دست و پا
 کس کو خبر اس کی مدد نازل نہ ہو

کبھی ہنتے نہیں کبھی روتے نہیں کبھی کوئی گناہ نہیں کرتے
 ہمیں صحیح کہاں سے ملے کہ کبھی کوئی رات سیاہ نہیں کرتے
 ہاتھوں سے اٹھاتے ہیں جو مکاں آنکھوں سے گراتے رہتے ہیں
 صحراؤں کے رہنے والے ہم شہروں سے نباہ نہیں کرتے
 بیکاری مٹی کاک ڈھیر بنے بیٹھے رہتے ہیں ہم
 کبھی خاک اڑاتے نہیں اپنی کبھی دشت کی راہ نہیں کرتے
 جی میں ہو تو در پر رہتے ہیں ورنہ آوارہ پھرتے ہیں
 ہم عشق اس سے کرتے ہیں مگر کوئی با تխواہ نہیں کرتے
 یہ تیرا میرا جھگڑا ہے دنیا کو نیچ میں کیوں ڈالیں
 گھر کے اندر کی باتوں پر غیروں کو گواہ نہیں کرتے

(۱۹۹۳)

جھلکرے خدا سے ہو گئے عبد شاب میں
 تب سے گرے پڑے ہیں جہان خراب میں
 کب کا وہ جا چکا تھا کھلی آنکھ جب مری
 میں اس کو دیکھتا ہی رہا جیسے خواب میں
 رنگینی لباس کا جنم غیر ہے
 شاید کہ میں نہ آؤں ترے انتخاب میں
 مجھ پر زکات حسنِ خن کی ہوئی ہے فرض
 شامل ہوا ہوں شعر کے اہل نصاب میں
 انھوکہ آئینہ بھی کہیں کا کہیں گیا
 رہ جاؤ گے یہیں جو رہو گے جتاب میں
 شاید قلمِ دوات کی فرصت نہ ہو اسے
 میرے ہی خط کو بھیج دیا ہے جواب میں
 چھپ چھپ کے دیکھتا تھا تغافل کی آز سے
 اس نے برت لیا ہے مجھے اجتناب میں
 وہ شمعِ انتظار کی تو کر گیا مجھے
 میں روشنی طبع سے ہوں پیچ و تاب میں
 آئیں ہوائیں دور سے باغ بہشت کی
 خوشبو بھی آئی دیر سے کارِ ثواب میں
 آئینہ نگاہ میں تعلیم اور تھی
 بر عکس ہو گیا جو لکھا تھا کتاب میں
 میں رہنے والا شام و سحر کے پرے کا ہوں
 ڈالا گیا ہوں شام و سحر کے حساب میں
 اس بے حسی کے نیچ میں احساس کی غزل
 دیکھو تو یہ سکوتِ خن کے جواب میں

چاند بھی حیران دریا بھی پریشانی میں ہے
 عکس کس کا ہے کہ اتنی روشنی پانی میں ہے
 جانے کس مسجد کی صورت بن رہی ہے خواب میں
 جانے کن سجدوں کی آہٹ میری پریشانی میں ہے
 غور سے دیکھو تو ہر چہرے کی بے نوری کا راز
 بادشاہ وقت کے چہرے کی تابانی میں ہے

(۱۹۷۸)

میں سیارہ ہوں میری بھی تو کوئی کہکشاں ہوگی
 مگر کس کو خبر سات آسمانوں میں کہاں ہوگی
 اب اس مسجد کے ہونٹوں پر ہے سب کچھ منحصر میرا
 نہ جانے کب کئے گی رات جانے کب اذاء ہوگی

(۱۹۸۶)

سونے سیاہ شہر پہ منظر پذیر میں
آنکھیں قلیل ہوتی ہوئی اور کثیر میں
مسجد کی سیڑھیوں پہ گدائر خدا کا نام
مسجد کے بام و در پہ امیر و کبیر میں
در اصل اس جہاں کو ضرورت نہیں مری
ہر چند اس جہاں کے لیے ناگزیر میں
میں بھی یہاں ہوں اس کی شہادت میں کس کو لاوں
مشکل یہ ہے کہ آپ ہوں اپنی نظیر میں
مجھ تک ہے میرے دکھ کے تصوف کا سلسلہ
اک زخم میں مرید، تو اک زخم پیر میں
ہر زخم قافلے کی گزرگاہ میرا دل
روئے زمیں پہ ایک لہو کی لکیر میں

(۱۹۹۲)

سانپ

سانپ لپٹئے گھوم رہا ہوں
 دنیا مجھ سے خوف زدہ ہے
 سب مجھ کو اچھے لگتے ہیں
 لیکن یوں بے
 جس لڑکی کو چاہا میں نے
 جس لڑکے کو دوست بنایا
 جس گھر میں ماں باپ بنائے
 جس مسجد میں گھٹنے لیکے
 سب نے میرا سانپ ہی دیکھا
 مجھ کو کوئی دیکھنہ پایا
 میں سب کو کیسے سمجھاؤں
 یہ دنیا کا سانپ نہیں ہے
 میرے ساتھ پلاپوسا ہے
 یہ میرا ماں جایا
 بس مجھ کو دوستا ہے

اشاعت

مجھ کو معلوم ہے
 میرے آسمان کا تنہا ستارہ
 میرے باغ کا تنہا ساپٹر
 میری شاخ کا تنہا گلاب
 اشاعت گھروں تک جاہی نہیں سکتا
 شہر کی شہرت تو پاہی نہیں سکتا
 لیکن میں خوش ہوں
 یہ روشنی، پھل اور خوشبو تو دیتا ہے

(۱۹۷۶)

لہو لہان آئینہ

اپنے آئینے سے
 میری خواہش رہی
 اس میں
 میری خراشیں
 مرے خون کی دھار میں
 ڈوب جائیں
 بڑے زخم کا عکس بن کر دکھیں
 لیکن ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکا
 میرا آئینہ
 خود بھی
 لہو میں نہایا ہوا
 زخم حد نظر
 اس میں میرا
 کوئی عکس بھی
 اپنی معصومیت میں اُبھرتا نہیں

سقوط

میں جب بھی سوچتا ہوں اپنے بارے میں
 کوئی قوت مجھے میرے مخالف کھینچتی ہے
 مجھے محسوس ہوتا ہے
 مر اہر عضو
 مرکز سے بغاوت کر چکا ہے
 خون کے دوران کے ہمراہ
 بکتر بندگاڑی میں
 مسلح فوجیوں کے ساتھ
 کوئی قید ہو کر جا رہا ہے
 کھل گئے ہیں سب مشام جاں کے پھانک
 کھڑی ہیں سر جھکائے صف بے صف
 ہارے ہوئے الفاظ کی فوجیں
 کوئی اس شہر کی تہذیب لے کر جا رہا ہے

خدا کا کنوارا

ایک آوارہ
 پیال فنگا
 گلندھا
 کتابوں سے کورا
 خدا کا کنوارا
 مہندب سماجوں کو
 صرف ایک انسان
 ہونے کی طاقت سے
 تاراج کرنا ہوا
 ایک سیمنار میں آگیا
 دم بخود سب کو سنتا رہا
 اور پھر چھ کریہ پکارا
 کہ تم سب مجھے گالیاں دے رہے ہو

التواء

دو مماثل ہاتھوں کی
 گھڑی سوئیاں
 کیساں ہندسوں کی گامز نہیں ہیں
 معدود میت کا وقفہ
 کسی کا ہم عصر نہیں
 میں بھی کسی کا ہم عصر نہیں ہوں
 معرضِ التوا کے باشندے
 اعرافیے
 جمع و تفریق، ضرب و تقسیم
 کا حاصل سفر ہیں
 کسی بھی نقطے سے
 کسی بھی نقطے تک
 کیسی بھی سطر کھینچو
 تعطلِ محض کا نقش گریزاں

تم نہیں آؤ گے
 میں بھی نہیں آؤں گا
 لیکن دونوں ہی

میں رونا چاہتا ہوں

حرکت میں ہوں گے
باہم دگر محفوظ حرکت
سب کچھ یوں ہی چلتا رہے گا
معاشی منصوبے بنائے جائیں گے
بازار بھر پور خرید و فروخت جاری رہے گی
روٹیاں پکیں گی
ڈکاریں آئیں گی
جاگنا اور سونا
جسموں کی وراثت
پشت در پشت انسانی سلسلے
چلتے رہیں گے

بس ایک بھول
مسلسل پس روی
بس وہ نہیں ہے
بس وہ نہیں ہے
بس وہ نہیں کاسفاک نعروہ
سب کوڑائے دھمکائے رکھے گا

تحریر کی فرصت

ڈاکیہ سارے جہاں کی خبریں
 لے کے آتا ہے مگر میرے لیے
 ایک سنائی کی افراتفری
 کتنی آوازیں مرے ساتھ چلا کرتی ہیں
 کبھی ماں باپ کے رونے کی صدا
 کبھی احباب کے پھٹتے ہوئے جو توں کی دکھن
 کبھی دنیا کے چھٹتے ہوئے اعضاء کی پکار
 صح تاشام وہی ایک ہی شب کا آہنگ
 درود یوار پہ اڑتی ہوئی راہوں کا غبار
 راکھ دانی میں وہی سیکڑوں سوچوں کا دھواں
 چائے کی پیالیاں پھینکنے ہوئے لمحات کو لپٹائے ہوئے
 شیلیف میں دبکے ہوئے ذہن کے ناپختہ نقوش
 میز پر نصف خطوں کا انبار
 کون جانے انہیں تحریر کی فرصت کب ہو؟

میں رونا چاہتا ہوں

لہر کا ٹھہر اور
 میں ایک لہر کا ٹھہر اور
 جنمے ہوئے خون کا دوران
 کئے ہوئے ہاتھوں کی پنجہ آزمائی میر اجہاد
 نوجوان بوڑھوں کی ناخود نوشت
 میری عصریت
 تاریخ میرے گھر کا بجھا ہوا چولہا
 روٹیوں سے زیادہ بھوک پکاتا ہے
 میرا شہر اس عورت کا حمل
 جو استقرار سے زیادہ اسقاط ڈھالتا ہے
 برسوں پہلے
 نطشے نے کہا تھا "خدامر گیا"
 اور آج
 جامع مسجد کے پیچھے والی بستی میں
 بوسیدہ مکانوں اور تاریک گلیوں میں
 ایک بوڑھا بھی
 یہی چلتا ہے —
 جامع مسجد کے چار میناروں سے
 رونے کے آوازیں
 نشر ہو رہی ہیں

اُدھر وہ دشت مسلسل ادھر مسلسل میں
 وہی ازل کا وہ سایہ وہی یہ پاگل میں
 ہر ایک گھر میں کسی اجنبی سار ہتا ہوں
 کسی کی عقل میں آتا نہیں یہ محمل میں
 تمام شہر کی آنکھوں میں ریزہ ریزہ ہوں
 کسی بھی آنکھ سے اٹھتا نہیں مکمل میں
 رکاب خاک میں الجھے ہیں آسمان کے پاؤں
 مرا خیال ہوا پڑھے اور پیدل میں
 کچھ اس قدر ہے پس خاک آنسوؤں کا جوم
 بس ایک بوندا بھر آئی اور جل تحل میں

آئندہ کی خبر ہوں گز شتہ نہیں ہوں میں
 ماضی ! ترے مزار کا کتبہ نہیں ہوں میں
 تجھ سے جدا ہے میری اشاعت کا سلسلہ
 اخبار دہر ! تیرا ضمیمہ نہیں ہوں میں
 زورِ زرِ رواں ہوں خیالات عصر کا
 بے فیض دولتوں کا دفینہ نہیں ہوں میں

(۱۹۷۸)

تمام قافلہ اک تنگ رہ گذار میں ہے
 کہ اب زمیں کا سفر آخری مدار میں ہے
 لہو کے پاس نہیں اپنے گوشت کی دیوار
 یہ آفتاب کہ صحرائے بے کنار میں ہے
 سوائے نیند کی شکلوں کے اور کچھ بھی نہیں
 تمام شہر کسی خواب خود گذار میں ہے
 ڈری ڈری ہوئی سر گوشیاں ابھرتی ہیں
 یہ کس کا خوف صدائوں کے کار و بار میں ہے
 عمارتوں کے بدن میں جڑے ہیں لاکھوں سر
 یہ سارا شہر مسلسل کسی مزار میں ہے
 ہر ایک اینٹ ہے بے شکل مئیوں کا سفر
 ہمارے گھر کی حفاظت بھی انتشار میں ہے

(۱۹۷۶)

تہائی کے آب روائ کے ساحل پر بیٹھا ہوں میں
 لہریں آتی جاتی رہتی ہیں دیکھا کرتا ہوں میں
 کون سالفظ ادا ہونے کا پس منظر ہے میرا وجود
 کس کا ہوں ہے میرے دل میں کیسا سنانا ہوں میں
 ہجر و وصال چراغ ہیں دونوں تہائی کے طاقوں میں
 اکثر دونوں گل رہتے ہیں اور جلا کرتا ہوں میں
 خالی درود یوار کی خوشبو پا گل رکھتی ہے مجھ کو
 جانے کہاں وہ پھول کھلا ہے جس کام جایا ہوں میں
 سب یہ سوچتے ہیں فرحت احساس تماشا ہے کوئی
 میں یہ سوچتا رہتا ہوں کس مٹی کا پتلہ ہوں میں

(۱۹۷۶)

خود آگئی
 وہ کیسی تاریک گھڑی تھی
 جب مجھ کو احساس ہوا تھا
 میں تنہا ہوں
 اس دن بھی سیدھا سادہ سورج نکلا تھا
 شہر میں کوئی شور نہیں تھا
 گھر میں کوئی اور نہیں تھا
 امام آٹا گوندھ رہی تھیں
 اب آچرپائی پر بیٹھے اونگھر ہے تھے
 دھیرے دھیرے دھوپ چڑھی تھی
 اور اچانک دل میں یہ خواہش اُبھری تھی
 میں دنیا سے چھٹی لے لوں
 اپنے کمرے کو اندر سے تالادے کر، کنجی کھو کر
 زور سے چینوں، چیختا جاؤں
 لیکن کوئی نہ سننے پائے
 چاقو سے ایک ایک رگ دریشے کو کاٹوں
 اور بھیانک سچائی کا دریا پھولے
 ہر کپڑے کو آگ لگا دوں
 شعلوں میں ننگے پن کا سناٹا کو ندے

میں رونا چاہتا ہوں

وہ دن تھا اور آج کا دن ہے

کمرے کے اندر سے تالا لگا ہوا ہے

کنجی گم ہے

میں زوروں سے چیخ رہا ہوں

میرے جسم کا ایک ایک ریشہ کٹا ہوا ہے

سب کپڑوں میں آگ لگی ہے

باہر سب پہلے جیسا ہے

کوئی نہیں جو کمرے کا دروازہ توڑے

کوئی نہیں جو اپنا کھیل ذرا سا چھوڑے

(۱۹۷۶)

تم کیسے جیے

تم کیسے جیے
 تم اتنے گھنے جنگل کے سفر میں
 کیسے جیے
 سب آوازوں سے منہ موڑے
 سناٹوں کی اک بین لئے
 دنیا کے بخیرستے پر
 تم چلتے رہے
 بے برگ و شمر پیڑوں کے تلے
 بے آبندی کے ساحل پر
 کیا بھوکِ مٹی
 کیا پیاس بجھی
 سانسوں کی ایک جگالی سے
 آنسو کی ایک صراحی سے
 تم کیسے جیے

معمول

میں بھی
 بادشاہ کی حکومت کا
 منکر ہوں
 لیکن جینے کی آرزو میں
 روز اس کی چوکھٹ پر
 سورج سا بھرتا ہوں
 شام ساڑو بتا ہوں
 گھر میں
 اعلانِ بغاوت کے طور پر
 بیوی بچوں کو مارتا ہوں
 رات رات جاگتا ہوں

میں وہاں پہنچا تو ہر شے سرد سنائے میں تھی
 اک ذرا سی پاؤں کی گرمی ابھی رستے میں تھی
 دیدہ و دل کی فضاؤں میں سفیدی چھائی
 کس قدر تھندی ہوا اس آخری لمحے میں تھی
 ایک آنسو سامری پلکوں میں الجھا تھا کہیں
 شاید اس کی ہی ذرا سی روشنی چہرے میں تھی
 بعد مدت کے ہوا آئی تو یہ ظاہر ہوا
 ایسی وحشت ناک خوشبو بھی مرے سینے میں تھی
 زرد پھولوں نے مرے ہونٹوں کا حلقة کمر لیا
 اک گل افشا سی خموشی اب مرے قصے میں تھی

(۱۹۷۸)

بدن کے سرخ پرندے کبھی ذرا ہل بھی
 لہوکی شاخ سے آگے ہے تیری منزل بھی
 یہ زرد سرد سے پتے بجھی بجھی شان خیں
 درخت نور سے بھردے طلوع ہو کھل بھی
 یہ شام ہے کہ سوریا طلوع ہے کہ غروب
 طسم رنگ توٹوئے کسی طرح مل بھی
 مری نگاہ میں صحراء ہو دور تک گلنار
 مجھے دکھائی پڑے تو بھی تیرا محمل بھی
 لہوکی دھار مجھے اس زمین تک لے چل
 کہ اک مقام پہ میں بھی ہوں اور مراد بھی

(۱۹۷۶)

سماعِ ختمِ دل و جانِ تن میں لوٹ آئے
 پھر آسمان سے اسی خاک پن میں لوٹ آئے
 وہ آگیا ہے تو آزاد ہو گئے ہیں ہم
 چلا گیا تو پھر اپنے بدن میں لوٹ آئے
 کھلا کہ شہر میں کچھ اور ہی ہے تنہائی
 سو گھوم پھر کے اسی انجمن میں لوٹ آئے
 تمام لفظ کہ سب کارکن تھے دنیا کے
 مری صد اپہ نئے خن میں لوٹ آئے
 یہاں ہے کون جو اب اس کا راستہ رو کے
 کہو خزاں سے کہ خالی چمن میں لوٹ آئے
 پڑی جو شام تو صرف اک کرن ہی باقی تھی
 سب آفتاں اسی اک کرن میں لوٹ آئے

(۱۹۹۲)

ہے شور ساحلوں پر سیلاب آرہا ہے
آنکھوں کو غرق کرنے پھر خواب آرہا ہے
بس ایک جسم دے کر رخصت کیا تھا اس نے
اور یہ کہا تھا باقی اسباب آرہا ہے
خاک وصال کیا کیا صورت بدل رہی ہے
سورج گزر چکا ہے مہتاب آرہا ہے
پانی کے آئنے میں کیا آنکھ پڑ گئی ہے
دریا میں کیسا کیسا گرداب آرہا ہے
آنکھوں کی پیالیوں میں بارش مچی ہوئی ہے
صحرائ میں کوئی منظر شاداب آرہا ہے

(۱۹۹۳)

پھر کے گھر کا سایہ

صحیح سوریہ

وہ بستر سے سائے جیسی اٹھتی ہے
پھر چولبے میں رات کی نہنڈی آگ کو
روشنی کرتی ہے

انتہے میں دن چڑھ جاتا ہے
جلدی جلدی چائے بنائے شوہر کو خست کرتی ہے
سیارے گردش کرتے ہیں
شہر میں صحراء، صحراء میں چیل میداں
کہساروں کے نشیب و فراز بنائے ہیں
سارے گھر کو دھوتی ہے
کپڑے، تولے، ٹوٹھ برش، بستر کی چادر
کوئی کتاب اٹھاتی ہے، رکھ دیتی ہے
ریڈیو آن کیا، پھر روکا، آن کیا
پھر کوئی پرانا خط پڑھتی ہے
(گھنٹی بجی)

”مریم! آجائو“

”تم کیسی ہو؟ وہ کیسے ہیں؟“

”کیا اس کا کوئی خط آیا؟“

(تحوڑی خاموشی کا وقفہ)

”تم کیسی ہو؟“

میں رونا چاہتا ہوں
 ”تم سے مطلب؟ پچ آبہ دوں تو کیا کرلوگی“
 ”دیکھو سب کی سب بیٹھی ہوں“
 (پھر سے خاموشی کا وقفہ)

”اچھا“

”اچھا“

(دروازہ پھر بند ہو گیا)

”اب کیا کرنا!“

گھر تو بالکل صاف پڑا ہے
 کوئی شکن بستر پ نہیں ہے
 دیوار و در ڈھنڈے ڈھلانے
 کوئی دھبہ یا مکڑی کا جالا، تنکا
 کہیں کچھ نہیں

کیا کرنا ہے!

اُف! وہ کلنڈر

کتنے برس ہو گئے پھر بھی
 آئیں تو ان سے کہتی ہوں
 بالکل نیا کلنڈر لائیں
 باور پھی خانے میں جا کر دیکھتی ہے اور پھر لوٹتی ہے
 کچھ بھوک نہیں

اب کیا کرنا ہے

لیٹ رہوں؟ لیکن کیا لیٹوں

جانے کتنا لیٹ چکی ہوں

کھڑی رہوں

ہاں کھڑی رہوں

پر میں تو کب سے کھڑی ہوئی ہوں
 کھڑکی کا پردہ ہی کھولوں

میں رونا چاہتا ہوں

دھوپ کہاں تک آپنی ہے

لاؤ اپنا لمب دیکھوں

نیر، شبنم، شفق، صبوحی، اختر، جو ہی

کیسے ہوں گے

آں! یہ میں ہوں

امی پیاری پیاری تھی میں

میں بالکل ہی بھول گئی تھی

سب کتنا اچھا لگتا تھا

ابا، اماں، بھیا، اپی

سب زندہ تھے

سایہ نانی، گلشن آپا

ہاں اور وہ گوریا بیا

آنسو، نفعے شور ٹھبھا کے سارے اک سر میں ہوتے تھے

ساری دنیا گھر لگتی تھی

ہر پل کام ہوا کرتا تھا

اماں ادھر بلایا کرتیں

اباً ادھر پکارا کرتے

بھیڑا نہتے

اپی ڈھیروں پیار جاتیں

کھانا، پینا، سونا، جاگنا، رونا، ہنسنا، روٹھنا، مٹنا

ڈور بند تھی تھی

ایک میں ایک پر دیا ہوا تھا

کل نمو کے گھر شادی ہے

پاس ہی کوئی موت ہوئی ہے

کالج کی چھٹی کب ہو گی

عید پھر اب کی تمیں کی ہو گی

میں رونا چاہتا ہوں

ہم بھی لیل قدر جا گیں گے
شہلا کی منگنی کیوں نوٹی؟
کیا اقبال کوئی شاعر تھا؟
چپ! بڑے اباں لیں گے
سائے دوڑر ہے ہیں گھر میں
ہر گوشے میں، اوپر نیچے، اندر باہر دوڑر ہے ہیں
لبے، چھوٹے، سبز و زرد، ہزاروں سائے
باہر شہر میں کوئی نہیں ہے
دھوپ سیہ پڑتی جاتی ہے
قد آدم آئینے میں
اس کاننگا جسم کھڑا ہے
جسم کے اندر سورج کا غنچہ مہکا ہے
سیارے گردش کرتے ہیں
سب انجانے سیاروں میں بھولے بسرے گھروشن ہیں
کس لمحے کا ہے یہ تماشہ
ہست و بود کے سنائے میں
لاموجود کی تاریکی میں
صرف یہی آئینہ روشن
صرف اک عکس گزشتہ روشن
بچھڑے گھر کا سایہ روشن

ہوا کے ہاتھوں میں قینچیاں ہیں

ہوا کے ہاتھوں میں قینچیاں ہیں
کہ پتے شاخوں سے ٹوٹ جائیں
گلابِ ثہنی سے چھوٹ جائیں
یہی سبب ہے

کہ ہونٹھ بوسوں کی باڑھ آتے ہی سوکھتے ہیں
کئی ہوئی انگلیوں سے محبوب جسم و جاں کو ٹوٹ لتے ہیں
اسی سے

دونوں ہتھیلیاں رخصتی کاروں مال بن گئی ہیں
بھویں کہیں آہنی طنابوں سی کھنچ گئی ہیں
یہ کشتیوں کے لیے ندی میں بھنور بنائیں
کھلے ہوئے پھول کو ہوائے خزان کا رخت سفر بنائیں
انہی کے باعث

دلوں کے خیمے اکھڑ گئے ہیں
تمام محبوب یا ب سینے اجڑ گئے ہیں
ازل سے

آغوش و صل بے چین پھر رہا ہے

خوش رہو

میں تمہاری آنکھوں میں
آنسو کا واحد قطرہ تھا
رخصت ہوا
اب تم خوش رہو

ملا ہے اب کے اک ایسا پڑھا لکھا محبوب
 جو میرے دل کے برابر دماغ رکھتا ہے
 ہر ایک لمحہ جو آتے ہیں تازہ پھول اس پر
 پس بدن وہ کہیں کوئی باغ رکھتا ہے
 بس ایک شعلہ خوں ہے جو اس کے ہونٹھوں کو
 چراغ سے بھی زیادہ چراغ رکھتا ہے

(۱۹۷۸)

برپا ہے اب کے عشق کی محفل دماغ میں
 کیا رقص کر رہا ہے مرا دل دماغ میں
 اس دشت میں جنوں کے لیے دو محاذ ہیں
 لیلا کا عکس دل میں ہے محمل دماغ میں
 عرصہ ہوا ہے دل سے مجھے منتقل ہوئے
 تو مجھ کو چاہتا ہے تو آمل دماغ میں

(۱۹۹۳)

مجھ کو ترے حضور کوئی پیش و پس نہ ہو
درپر ترے اگر یہ چراغ نفس نہ ہو
دونوں بدن اتار کے آجائیں اس جگہ
پھر یوں چلیں کے کوئی صدائے جرس نہ ہو
ہونٹوں کے آبشار پہ ننگے نہائیں ہم
بوسوں پر اک لباس ہوا وہوس نہ ہو

(۱۹۸۳)

چراغ جیسے اندھیرے گھروں میں جلتے تھے
نہ کوئی غم تھا نہ کوئی خوشی اکیلے تھے
ہمیں یقین ہی نہیں تھا کسی کے ہونے کا
اسی لیے اسے چھو کر بھی دیکھ لیتے تھے
کسی بھی ایک میں اس کی سی بودو باش نہ تھی
ہزار ہا در و دیوار جیسے چہرے تھے

(۱۹۸۳)

مرا بدن مجھے تکلیف دے رہا ہے بہت
 یہ افتراق مٹا دے سکون مل جائے
 ہوس کی ساعت نادار میں وصال اس کا
 کہ جیسے موسم سرما میں اون مل جائے
 میں اس کے دل پہ چھتیس ڈال دوں محبت کی
 کہیں جواس کی نگہ کاستون مل جائے
 میں اپنے بحر کے ساحل پہ مضطرب ہوں بہت
 کسی طرح وہ تبہ اندر وون مل جائے
 اک ایسی بات کہوں گا جو ہر زبان پہ ہو
 ذرا جو میرے لبوں کو جنون مل جائے

(۱۹۸۳)

ایک ہی رات میں جل بجھ گئی صورت تیری
 معجزہ کچھ نہ دکھا پائی محبت تیری
 آج کی رات کوئی چاند نہ چہرہ نہ چرانغ
 آج کی رات مجھے پھر ہے ضرورت تیری

(۱۹۷۶)

حملہ

بُرا کیا یہ تم نے بے وفائی کی میں سورہا تھا تم نے
 مجھ کو نوج کر جگادیا مرے بدن میں اپنے
 تیز دانت تک گڑا دئے میں چیختا رہا مگر مرا
 گلا دبوچ کریہ ظلم ہے میں بار بار کہہ رہا تھا
 چھوڑ دونہ لے چلو تمہی نے اپنی بے لباس لذتوں
 کی آگ سے چھوا کہ میرے ہونٹھ جل گئے اہولہ ان
 گوشت کا وہ لو تھرا بھی کٹ کے گر گیا بدن میں صرف
 خون کا ابال انگلیوں کی پور پور میں تھکن نہ اہتزاز جاں
 نہ خود کلامیاں مکالمہ رہا ہوا مکالمہ تواب بتاؤ
 محفل مذاکرہ کے بعد اور کیا کہوں کہ وہ زبان کٹ چکی
 وہ ہونٹھ چور چور ہیں بتاؤ اب مرے بدن پہ کوئی بھی
 قمیص کوئی بھی ازار پال تو سبھی مگر وقار مند ہونہ آئے
 گامری برہنگی تمہارے بے لباس جسم کا بدل نہیں برہنگی
 اٹوٹ ہے اسے جو لذتوں کی چاث پڑ گئی نہ جائے گی مگر
 تمہارا جسم بھی یہ کب تلک کہ ریت ہے بس ایک گھونٹ
 آب جو کہ پی چکا جو لوٹ کرنہ آئے گا سوائے یہ کہ قے
 کروں بڑی سی قے کہ لذتیں عروس آفتاب کی ضیافتیں قلع قلع
 غروب ہوں تمام شام اوڑھ لوں برہنگی کی درزیوں کو ناپ دوں
 کہ رات بھر نفس کا تار سوئی کے شگاف سے نکال لوں کہ پھر
 سے نیند آسکے کہ پھر سے کوئی اپنے تیز دانت سے نہ سلک جان کاٹ دے

وعدہ

سورج کے گولے کو
 مٹھی میں بھینچ کر
 وعدہ کرتا ہوں
 جب تک
 پورے کا پورا انجگارا
 تمہارے چہرے میں نہیں بدلتا
 تب تک دنیا میں
 شام ہی ہو گی
 اور نہ میری
 ہتھیلی کے گھاؤ ہی بھریں گے

(۱۹۷۶)

/

ادارہ

جب بھی تمہارا
ذکر آیا ہے
جانتے بوجھتے پھی سادھلی ہے
ڈرتا ہوں
تمہارا نام
ہونٹوں سے چھوٹتے ہی
ایک ادارہ بن جائے گا

(۱۹۷۶)

وہ رات میں

وہ رات میں
 کتنی روشن تھیں
 جب میں اور تم
 لمبی سنسان چھتوں پر
 چاند نی کے پھول چنتے تھے
 ہمارے بدن کی سرحد پر
 چپ چاپ
 کھلتی تھیں بیلے کی کلیاں
 ساری ساری رات
 ستاروں کی پھوار میں
 بھیگتے رہتے تھے

میں رونا چاہتا ہوں

وہ آئے تو درشن پاؤں
مشی کی دیوارِ گرے اور روپ کادرپن پاؤں
اپنی پچھوئی نہاروں نس دن بچھڑائیوں پاؤں
کام گلیل کریں سب جذبے، ہر اجرا بن پاؤں
سارا تن سونا بن جائے، آلنکن دھن پاؤں
جنگل میں منگل ہو جائے تپو بھومی بن پاؤں
اس کی چرن دھول مل جائے پھر سے جیون پاؤں

تم بُن اور کہاں میں جاؤں
اندھیاری رینا میں کس کا سوتا گھر کھٹکاؤں
خیز سرے سے کتحاناؤں سب کچھ پھر سے گاؤں
جو بھی بچے کچے آنسو ہیں ان سے بھی رو جاؤں
تن کے چھالے تو دکھاؤں، من کا کیا دکھاؤں
جو کچھ موں پڑا ہے کیسے اس کا بجید بتاؤں
شبدوں میں شبدوں کے سکت کو کیسے سمجھاؤں

وہ آئے تو میں گھر جاؤں
اندھیاری، رینا ہنکارے روم روم ڈر جاؤں
کیسے کیسے پنے دیکھوں لاج سے بھر بھر جاؤں
میں یوں سنکوچ کی ماری دیہہ لتا پر جاؤں
اس کی پریم شکھاروشن ہوتی من سے ور جاؤں
چھبیں آلنکن کا سونا چاندی سب دھر جاؤں
جس کی چوری کا ڈر ہوتا ہے ارپن کر جاؤں

مرے ماسوا

اسے بھینچ لوں
 تو مرے بدن سے
 وہ چاندنی کی امنڈ پڑے
 کہ مرے وجود کی رات میں
 مری ذات میں
 کوئی پھول ہو تو مہک اٹھے
 کوئی نور ہو تو چمک اٹھے
 کوئی بول ہو تو ہمک اٹھے
 اسے چوم لوں
 تو بول پر بھی
 گلاب جیسے گلاب ہوں
 مگر اس کے جسم تک آج تک
 کوئی لب گیا
 نہ وہ ہے کسی کے حصار میں
 کہ تمام روئے زمین پر
 وہی ذات ہے
 وہی بے کنار کی رات ہے
 کہ تمام دشت بول ہے
 میرے ماسوا
 مجھے اپنے گرد حصار دے
 مجھے اپنا بوس و کنار دے

رہائی

کسی طرح
 بس میں تمہارے دروازے تک
 پہنچ جاؤں
 پیچھا کرتی پولس کی گاڑیاں
 ڈانج کھا جائیں گی
 ان کے پاس میرے
 شناختی کارڈ کے سوا
 اور کچھ بھی نہیں
 وہاں اس گھر میں
 سپردگی کے شفاف موسموں کے گھر میں
 ہر وقت ایک شنہنڈی سی نرم سی آگ روشن رہتی ہے
 وہیں
 ہوا کی لازوال الگنی پر
 میرے دھلے ہوئے دودھ کپڑے جھولتے ہوں گے
 ان کو پہنچتے ہی
 شناختی کارڈ پر آویزاں
 میرے جرام کے سارے خطوط
 تاریک ہو جائیں گے

تمہارے آغوش میں آتے ہی
 دنیا کی تمام پولیس کے ہاتھوں سے
 خود بخود چھوٹا جا رہا ہے

پرواز

تم نے مجھ سے
 اڑتے ہوئے تلی کے رنگ مانگنے تھے
 کہا تھا
 یہی میرے سہاگ کا جوڑا بنیں گے
 انہی کا پیچھا کرتے کرتے
 گھنے جنگلوں تک آگیا ہوں
 دنیا کے اس پار کے گھنے جنگل
 تمہارے آغوش کی خوشبوؤں کے بنے جنگل
 کیسی بے خوفی ہے
 اچھا ہے تم بھی
 اگلی پرواز سے یہیں چلی آؤ
 میرا پتہ ہے
 جسم سے ذرا آگے
 روح کی گہری ڈھلان کے نیچے
 بہتے ہوئے دریا کے کنارے
 ایک ہوا دار کشیا!

بدن بانسری

کیا تم نے کبھی
 ساحل پر لیٹ کر
 اُبھرتے ہوئے جسم سورج
 کو دیکھا ہے
 کیا تم نے کبھی
 گوشت کی صبح ہاذب کو
 سوریا ملتے دیکھا ہے
 کیا تم نے
 انسانی بدن کو
 اچانک
 بانسری کی تان میں ڈھلتے ہوئے
 دیکھا ہے

اک ہوا آئی ہے دیوار میں درکرنے کو
 کوئی دروازہ کھلا ہے مجھے گھر کرنے کو
 دور صحرائیں کوئی زلف سی لہرائی ہے
 کوئی بادل ساڑا ہے مجھے ترکرنے کو
 نظر آئی ہے کسی چاند کی پر چھائیں سی
 شب ہستی میں مرے ساتھ سفر کرنے کو
 آمجھے چھو کے ہرا رنگ بچھادے مجھ پر
 میں بھی اک شاخ سی رکھتا ہوں شجر کرنے کو
 اے صدف سن ! تجھے پھر یاد دلادیتا ہوں
 میں نے اک چیز تجھے دی تھی گھر کرنے کو

(۱۹۹۲)

اس کی یاد اس بار اک تلوار بن کر آئی ہے
 بوندپانی کی لہو کی دھار بن کر آئی ہے
 کل بھی آئی تھی محبت میں جنوں کی شکل میں
 اب کے تہائی مر اگھر بار بن کر آئی ہے
 کل جو تیر انام لے کر دربہ در پھرنے میں تھی
 پھر وہی وحشت درود یوار بن کر آئی ہے
 کون سی ایسی فضاء ہے وہ مرے دل کے سوا
 تو کہاں سے اس قدر گلزار بن کر آئی ہے
 وہ فقیری صبر استغنا کی صورت آئی تھی
 یہ فقیری درہم و دینار بن کر آئی ہے

(۱۹۷۸)

اس کے ہو نھوں کے بھنو رگھرے قیامت خیز ہیں
 اس کے بوسوں میں کہیں بھی دور تک ساحل نہیں
 اس سے ملنا اس کو چھونا اور مر جانا وہیں
 اتنا چھوٹا سا وصال یار بھی حاصل نہیں
 دو بدن تھے سو وہ اپنی آگ کا ایندھن ہوئے
 اب ہوا کوئی ہمارے درمیاں حائل نہیں

(۱۹۷۸)

جس کے پاس آتا ہوں اس کو جانا ہوتا ہے
 باقی میں ہوتا ہوں اور زمانہ ہوتا ہے
 عشق میں پہلا بوسہ ہوتا ہے آغاز حیات
 دوسرے بوسے کے پہلے مر جانا ہوتا ہے

(۱۹۹۰)

جسم کے پار وہ دیا سا ہے
 درمیاں خاک کا اندھیرا ہے
 کھل رہے ہیں گلب ہونٹھوں پر
 اور خوابوں میں اس کا بوسہ ہے
 میرے آغوش میں سما کر بھی
 وہ بہت ہے تو استعارہ ہے
 پھر سے ان جوئے شیر آنکھوں نے
 بے ستون جسم کو گبرایا ہے
 وہ تمہاری ہری بھری آنکھیں
 ریت کو دیکھ لیں تو سبزہ ہے
 بس ترا نام بول دیتا ہوں
 اور ہونٹھوں کے پاس دریا ہے
 روشنی سے بھرا ہوا اک شخص
 شہر بھر کے دیے جلاتا ہے
 آنکھ بھر دیکھ لو یہ ویرانہ
 آج کل میں یہ شہر ہوتا ہے
 عشق اخبار کب کا بند ہوا
 دل مرا آخری شمارہ ہے

خاک ہے میرا بدن خاک ہی اس کا ہو گا
 دونوں مل جائیں تو کیا زور کا صحراء ہو گا
 پھر مراجوم مری جاں سے جدا ہے دیکھو
 تم نے ٹانکا جو لگایا تھا وہ کچا ہو گا
 تم کو روئے سے بہت صاف ہوئی ہیں آنکھیں
 جو بھی اب سامنے آئے گا وہ اچھا ہو گا
 روز یہ سوچ کے سوتا ہوں کہ اس رات کے بعد
 اب اگر آنکھ کھلے گی تو سویرا ہو گا
 کیا بدن ہے کہ ٹھہرتا ہی نہیں آنکھوں میں
 بس یہی دیکھتا رہتا ہوں کہ اب کیا ہو گا

(۱۹۸۳)

کئی ہوئی شاہ رگ سے بہتے ہو سارو شن جمال اس کا
کھلے ہوئے زخم پر مسلسل نمک کی بارش خیال اس کا
میں اس کی جانب بڑھا چلا جا رہا ہوں بڑھتا ہی جاؤں گا میں
اگر چہ اب تک حمایت ہجر میں پڑا ہے وصال اس کا

(۱۹۹۳)

نہ یہ ممکن کہ اپنے درد کو تحلیل کر دوں
نہ یہ ممکن کہ اس بے درد کو تبدیل کر دوں
مرے بس میں نہیں ہے ورنہ تا روز قیامت
میں اس دنیا کے دفتر میں ابھی تعطیل کر دوں

(۱۹۸۰)

پھر وہی موسم جدائی ہے
 پھر مجھے اپنی یاد آئی ہے
 پھر پڑھا میں نے تیرا پہلا خط
 پھر سے تجھ تک مری رسائی ہے
 پھول سا پھر مہک رہا ہوں میں
 پھر ہتھیلی میں وہ کلائی ہے
 پہلے بوسے کی نیم گرم آہٹ
 پھر رگ جاں میں رت جگائی ہے
 پھر ہری ہے تمام تنہائی
 پھر سے پانی کو سبز پائی ہے
 پھر مرا ہے تمام سنائیا
 پھر مری بازگشت چھائی ہے
 پھر زمانہ مری گرفت میں ہے
 پھر مجھے وہم کبریائی ہے
 پھر تجھے چھوکے دیکھتا ہوں میں
 پھر سے قندیل سی جلائی ہے
 پھر تصور میں تیرے لب آئے
 میری ہربات پھر حنائی ہے
 ڈھیر ہے پھر سے خاک کی دیوار
 پھر مجھے ذوق رونمائی ہے
 پھر وہی میں نیانیسا بہوا
 پھر زمیں سے مری رہائی ہے

جو عشق چاہتا ہے وہ ہونا نہیں ہے آج
 خود کو بحال کرنا ہے کھونا نہیں ہے آج
 آنکھوں نے دیکھتے ہی اسے غل مچادیا
 طے تو یہی ہوا تھا کہ رونا نہیں ہے آج
 یہ رات اہل بھر کے خوابوں کی رات ہے
 قصہ تمام کرنا ہے سونا نہیں ہے آج
 جو اپنے گھر میں ہے وہ ہے بازار میں نہیں
 ہونا کسی کا شہر میں ہونا نہیں ہے آج
 پھر طفل دل ہے دولت دنیا پہ گریہ بار
 اور میرے پاس کوئی کھلونا نہیں ہے آج

(۱۹۷۸)

یہ ایک جیسا جنوں بار بار کرتے ہوئے
 میں تھک گیا ہوں دل و جاں شمار کرتے ہوئے
 بچھڑ گیا ہے کہیں کوئی ہم سفر میرا
 میں خود کو بھول گیا ہوں شمار کرتے ہوئے
 ہم آگئے ہیں بہت دور اپنے خیے سے
 خود اپنے دشت میں اپنا شکار کرتے ہوئے
 میں اپنے خواب ان آنکھوں میں چھوڑ آیا ہوں
 جو بچھ گئی ہیں مجھے اشک بار کرتے ہوئے
 بس اپنی مسجد خاکی میں سجدہ ریز ہوں میں
 گزر رہے ہیں زمانے پکار کرتے ہوئے

(۱۹۹۹)

کعبہ دل دماغ کا پھر سے غلام ہو گیا
 پھر سے تمام شہر پر عشق حرام ہو گیا
 میں نے تو اپنے سارے چھوٹے اس کے چمن کو دے دیے
 خوشبو اڑی تو اک ذرا میرا بھی نام ہو گیا
 یار نے میری خاک خام رکھ لی پھر اپنے چاک پر
 میں تو سفر پہ چل پڑا میرا تو کام ہو گیا
 جب بھی ہوئی اذان وصل ہم نے بچھائی جانماز
 ہجر کا ایک پاس باں بڑھ کے امام ہو گیا
 سارے حواس کے چراغ سو گئے انتظار میں
 عشق تو برقرار ہے شوق تمام ہو گیا

(۱۹۹۳)

اتنے بڑے شہر میں کوئی نہیں ہے مرا
 جس سے ملاقات تھی وہ بھی روانہ ہوا
 بیٹھے بٹھائے یوں ہی اس سے محبت ہوئی
 پھر وہ چلیں آندھیاں شہر کا صحراء ہوا
 گھنٹیاں بجتی رہیں لوگ گزرتے رہے
 لوگ گزرتے رہے میں ترے درپر رہا
 دھوپ کے ذلتے ہی لوگ اپنے گھروں کو گئے
 وہ جو مرے ساتھ تھا جانے کہاں کھو گیا
 دل میں بڑی آگ تھی راگ کی بیراگ کی
 اس میں مرا سر جلا اس میں مرا گھر جلا

(۱۹۷۶)

پہلے پہلے پھول کا شاخوں چ آنا یاد ہے
 باغ میں وہ پہلے بوسے کا زمانہ یاد ہے
 ساری دنیا کی سیاہی اور دو پُر نور دل
 دو دلوں کا رات بھر شمعیں جلانا یاد ہے
 جس قدر تھا تیرے ہونے سے خدا سے بھی نہ تھا
 وہ مری تنہائیوں کا آب و دانہ یاد ہے
 یاد آتی ہے وہ اثبات و نفی کی کش مکش
 کش مکش میں آنسوؤں کی راہ پانا یاد ہے
 باتوں باتوں میں کہیں آگے نکل جانا بہت
 اپنے جسموں کو بھی پچھے چھوڑ جانا یاد ہے
 مجھ کو اپنی آرزو میں خاک کر دینے کے بعد
 پھر سے میری خاک سے مجھ کو اٹھانا یاد ہے
 ایک دن آنا تری کشتی کالے جانا تجھے
 اور مجھ کو ساحلوں پر چھوڑ جانا یاد ہے

وہ میری جاں کے صدف میں گھر سارہتا ہے
 میں اس کو توڑ نہ ڈالوں یہ ڈر سا رہتا ہے
 وہ چہرہ ایک شفاخانہ ہے میرے خاطر
 وہ ہو تو جیسے کوئی چارہ گھر سارہتا ہے
 میں اس نگاہ کے ہم راہ جب سے آیا ہوں
 مجھے نہ جانے کہاں کا سفر سارہتا ہے
 بڑا وسیع ہے اس کے جمال کا منظر
 وہ آئینے میں تو بس مختصر سا رہتا ہے
 مری زمیں کو میسر ہے آسمان اس کا
 کہیں بھی جاؤں مرے ساتھ گھر سارہتا ہے

(۱۹۷۸)

وہ اپنے خدوخال میں پایا نہیں جاتا
 وہ شکل ہے اس کی کہ بتایا نہیں جاتا
 میں اس سے بچھڑتے ہوئے لمح کی زمیں پر
 وہ نقش ہوا ہوں کہ مٹایا نہیں جاتا
 اس کے کسی گوشے میں کہیں خود کو چھپا کر
 بھولا ہوں تو پھر یاد ہی آیا نہیں جاتا
 جاگے وہ کسی طرح تو دنیا میں ہم آئیں
 وہ نیند میں یوں ہے کہ جگایا نہیں جاتا
 اس دل میں ترے چھوڑ کے جانے کی جگہ پر
 کیا ٹوٹ گیا ہے کہ بنایا نہیں جاتا

(۱۹۷۸)

کوئی سناتا محبت کا بدل ہوتا نہیں
 ہوتا رہتا ہے ابد لیکن ازل ہوتا نہیں
 اس کا وعدہ ہے کہ ہم کل تم سے ملنے آئیں گے
 زندگی میں آج اتنا ہے کہ کل ہوتا نہیں
 جانے کیا غم ہے کہ برگ وبار آتے ہی نہیں
 جانے کس مٹی کا پودا ہوں کہ پھل ہوتا نہیں
 ان دنوں دل سے بدن کارستہ موقوف ہے
 دست و پامصروف ہوتے ہیں عمل ہوتا نہیں
 کیا قیامت ہے کہ اس کے خواب آتے ہیں مجھے
 اور میری نیند میں کوئی خلل ہوتا نہیں

(۱۹۷۶)

تو مجھ کو جو اس شہر میں لایا نہیں ہوتا
 میں ، بے سروسامان ، کبھی رسوا نہیں ہوتا
 کچھ پیڑ بھی بے فیض ہیں اس راہ گزر کے
 کچھ دھوپ بھی ایسی ہے کہ سایا نہیں ہوتا
 خوابوں میں جو اک شہر بنادیتا ہے مجھ کو
 جب آنکھ کھلی ہو تو وہ چہرا نہیں ہوتا
 کس کی ہے یہ تصویر جو بنتی نہیں مجھ سے
 میں کس کا تقاضا ہوں کہ پورا نہیں ہوتا
 میں شہر میں کس شخص کو جینے کی دعا دوں
 جینا بھی توبہ کے لیے اچھا نہیں ہوتا

انقلاب کی دستک

تمہاری مندی ہوتی پلکوں کے نیچے
 چراغ سا جلتا ہوں
 تم کو پتہ ہے؟
 تمہاری گھر کی کے بند کواڑوں کا باہری حصہ اب تک میرا ہے
 جاڑے کی اس طویل رات میں
 بے لباس
 میرے بدن کی تحریک
 تمہارے لحاف میں دُکے بدن کی گرمی سے
 قائم ہے
 طویل سنسان ہوتی ہوئی سڑک پر
 کہرے سے بجھی ہوتی روشنی
 ٹیاں اوڑھے لاوارث کے
 گھروں کو لوٹتے چورا چکے
 خاموش ہوتی پہرے داروں کی آہٹ
 پیچھے بھاگتا ہوا
 سب کچھ ٹوٹتا ہوا
 میں ہی
 ازل کا مقبول
 تمہاری ہر ایک کروٹ کو
 انقلاب کی دستک سمجھتا رہا

اداسی کانور

اُداس تو بہت ہوں
 لیکن اب بھی
 میری انگلیاں
 تمہارے چہرے کے نور سے
 بھیگی ہیں
 اب بھی میں ان کو
 آنکھوں پر رکھ کر
 آنسوؤں کی جھڑی سے
 دھوپ کی ٹہنی کو
 ہرا کر سکتا ہوں
 تمہاری تصویر کو
 چھکنے والا ایک
 پرندہ کر سکتا ہوں

کچھ بھی ضائع نہیں ہو گا

نہیں

اب یہ کچھ بھی
ضائع نہیں ہو گا
تمہاری شاخ کے
سارے ہرے پتے
مر جھا کے ٹوٹے تو
میری ہواں میں
کشتنی بن جائیں گے
تمہاری ان آنکھوں سے
آنسو اب ٹپکے تو
مجھ میں ہی آئیں گے
موتی بن جائیں گے
تمہارے ان ہو نھوں کے
پرندے چھوٹے تو
میرے دیر انوں کی
مستی بن جائیں گے
نہیں

اب یہ کچھ بھی
ضائع نہیں ہو گا

ہوس برف رات

تمام دنیا
 ہوس کی یہ برف رات کالی
 مرا بربند بدن جگائے
 سبھی نیند پیر ہن جلائے
 تمام دروازے جنم چکے ہیں
 وہ خواب آوازے بھنم چکے ہیں
 میں کیسے اس دھوپ گھر کو جاؤں
 جہاں تمہارا طلوع چہرہ
 اُداس برستے
 دراز ترستے
 کہ یہ ہوس برف رات کلتی
 تو سب ندی باندھ ٹوٹ جاتے
 جگے جگے نیند میں نہاتے

رات ہوئی

تم کو پالینے کو دھن میں
 دنیا اور ڈھمی
 رنگ برلنگے کپڑے پہنے
 پیشانی پر سورج باندھا
 آنگن بھر میں دھوپ بچھائی
 دیواروں پر سبزہ ڈالا
 پھولوں پتوں سے اپنی چوکھٹ رنگوائی
 موسم آئے
 موسم بیتے
 سورج نکلا دھوپ کھلی
 پھر دھوپ چڑھمی پھر اور چڑھمی
 پھر شام ہوئی
 پھر گھری کالی رات ہوئی

ہوا سے واسطہ

تمہارے پہلے
 بوسہ آفتاب سے
 یہ مرے سارے ہو نہ راکھ ہو گئے
 کہ تم تو ایک روز بھر جلے
 جو شام آئی چل دیے
 مگر مجھے بتاؤ
 کیا کروں؟
 کہ اب جو کالی رات ہے
 کہ دور تک کوئی چراغ در نہیں
 کہ واکروں
 نہ لفظ ہیں
 جو رات بھر دعا کروں
 میں کیا کروں
 کہ اس گھری ہوا سے
 میرا واسطہ عجیب ہے

چہرہ

تم
اپنے سینے کا
آئینہ کھلار کھنا

میں
جب بھی آؤں گا
چہرہ بن جاؤں گا

۱۹۷۸

کھو جانے دو

اپنے
بدن کے
اس جنگل میں
کبھی تو جانے دو
مجھ کو کھو جانے دو

(۱۹۷۸)

زخم

جب تک
 تمہارے چہرے پر
 خون کی روائی ہے
 میری آنکھوں کے زخم
 تازہ رہیں گے

(۱۹۷۸)

بس ایک بار

ایک بار کسی طرح
 تمہارے ہو نٹھوں پر
 ہو نٹھ رکھ دوں
 پھر چاہے
 عمر بھر
 کچھ بھی نہ بولوں

(۱۹۷۸)

بے حصار

بھینی بھینی

گوشت کی خوشبو سا

تمہارا بدن

ہو نئھ اس کوڈھونڈتے رہتے ہیں

انگلیاں اس کو باندھنے کو ترسی رہتی ہیں

خون کی بوندیں

اس کی دروازوں پر

دستکیں دیتی ہیں

اور وہ سب کی گرفت سے باہر

روح کے باغ میں

اڑتا پھرتا ہے

(۱۹۷۶)

پہلے بو سے کی یاد میں

تمہارے ہو نھوں کی
 اُداس شہنی پر
 پہلے بو سے کا
 بھیگا پر ندہ
 سہا پڑا ہے
 کون جانے کب تک دھوپ لکے
 ہوا چلے
 شہنی بنے
 پر ندہ گائے

تمہارے ہو نھوں کی
 بند دہیز پر
 پہلے بو سے کا
 ننھا چراغ
 کانپ کانپ اٹھتا ہے
 باہر جاڑے کی کالی ہوا میں

جانتی نہیں ہیں
سوئے ہوئے گھر میں
اس کا بھی طاق ہے

تمہارے ہو نھوں کے

اتھاہ دریا پر
پہلے بو سے کی
ٹوٹی ہوئی کشتی
ہچکیاں لیتی ہے
ساحل پر چھوٹ گئی
اواس ڈرپوک مٹی
سامنے افق پر
تمہاری روح
کلکاریاں بھرتی ہوئی
آواز دیتی ہے
آہستہ آستہ
آہستہ آستہ!

تمہارے ہو نھوں کی
اتھاہ رات میں
پہلے بو سے کی

چڑھی چاندنی
 ایک ایک انگ میں
 گوشت کی بوٹی بوٹی میں
 ہڈیوں کی سرگنگ میں
 خون کے آنگن میں
 چھٹلی ہوئی چاندنی
 لیکن بدن کی دیوار کے پیچھے
 کتنا اندھیرا ہے
 کتنا گھنا گہرا اندھیرا
 تمہارے ہونھوں کے
 اتھا جنگل میں
 پہلے بو سے کی
 لال لال خوشبو کیں
 بھٹکے مسافر کو
 راستہ دکھاتی ہیں

حسیت کا انگلاظ نامہ

تمہاری کتاب میں
استدلال اور وضاحت کی تردید
استدلال اور مکمل وضاحت سے
قائم کی گئی ہے
تم نے شعور کے ہاتھوں
تحت الشعور کو خوب کھنگالا ہے
تعیروں کے ذریعے خواب تک پہنچے ہو
محسوس اور ارق اور مری رoshani کی عصریت میں
مجرا اور نادیدہ کے ازل اور ابد
خوب خوب چمکائے ہیں
لیکن کتابت کی غلطیاں بہت ہیں
وجود کی دہشت کی جگہ
ایک جما ہو اکنہ لکھا ہے
ذات کے ابہام کی جگہ
روزمرہ کا معمول
روحانی مہم جوئی
کڑھے ہوئے جزدان سے بدل گئی ہے
ترتی کی درخواستیں
اعلا کار کر دگی کے سند نامے
افادیت کی تصدیقیں
تازہ ترین سوت کی پیمائش
اور مشاق معماروں سے خفیہ مشورے
تمہاری حسیت کا انگلاظ نامہ ہیں

رات پر شاعری

سنسان بیہر رات میں
 گتھم گتھا سر اہمیں
 اٹھا پٹک سر گوشیاں
 گالم گلوچ
 دور بجتی ہوئی سیماں
 ”ارے کوئی ہے؟“
 دور دور تک رات کی جھاڑیوں میں
 ابھی ہوئی زخمی بازگشت
 دھیرے دھیرے پکتے ہوئے خون کے قطرے
 ٹپ ٹپ برستا بیباں
 اماں اماں! بازگشت اماں اماں!
 ساکت صامت شجر خاموش
 رات کا آخری پھر خاموش
 اور سورج نکتے ہی
 روزناموں کی بڑھتی ہوئی خرید
 مذاکروں کا شور
 ایوان حکومت میں حزب اختلاف کا انخلا
 واقعات شب پر لکھی شاعری
 ہم عصر ادب میں اضافے کا شور

سِلک معانی
 بحث میں الجھا ہوا میں
 کب سے تیر ا منتظر ہوں
 اے مرے موضوع!
 میرے ذہن کو
 سِلک معانی دے!
 کہ سارے منتشر الفاظ
 ہو نہیں پر
 ترے چہرے کے خط و خال میں
 مر بوط ہو جائیں
 مرے شعروں میں تیر المس گھل جائے
 سلوںے جسم کی سوندھی مہک
 ڈھل جائے میرے استعاروں میں
 کہ جب بھی کوئی نقاد جرح پیشہ
 ادھر آئے
 تو پچھلی رات کی تیاریوں کو بھول کر
 تیری سہانی چھاؤں میں
 دم بھر کو سو جائے

عاجزی

تم میرے سامع!
 میرے قاری!
 جب تک زندہ ہو
 میں بولتا رہوں گا
 تسلیوں کے رنگ بکھیرتا رہوں گا
 ان میں سے اگر کچھ
 ان بولارہ جائے
 ایک آدھ لفظ دھنڈ لارہ جائے
 اپنی طرف سے جوڑ لینا
 تمہی نے میری پوری تصویر دیکھی ہے
 میرے پس منظر سے خوب واقف ہو
 میرے ہمزراو!
 میرے ابہام کو غرور مت سمجھنا
 اڑتے ہوئے بادل مٹھیوں میں آتے ہی کب ہیں
 ہاتھ آتی ہیں چھوٹی چھوٹی بوندیں
 یہی کچھ پی کر
 سورج سے دعا کرنا
 بھیوں کو تاؤ دے
 ندی کا آنچل اڑنے لگا ہے

گھر لوت کے آجائے

اے میرے پر دلیسی پیارے
 میرے شاعر دلیس نکالے
 بہت ہوا بن باس
 کہ اب گھر لوت کے آجائے
 تیرے پنگھٹ کی گوری کی گاگر کب سے روئے
 کوئی نہیں جو چھین جھپٹ کے انگیا انگ بھگوئے
 گوری سے کر پیار
 کہ اب گھر لوت کے آجائے
 شام ترے دروازے بیٹھی کا جل بخ سجائے
 بالوں میں نخنے نخنے تاروں کے دیپ جلانے
 اس کا کرستکار
 کہ اب گھر لوت کے آجائے
 تیرے بچپن کی وہ لڑکی گڑیا گڈوں والی
 اس کا سینہ ابھر رہا ہے اس کی کر رکھوائی
 چڑھری دے اپہار
 کہ اب گھر لوت کے آجائے
 اب بھی سب بازار وہی ہیں سارے کھیل تماشے
 اب بھی نوٹنگی کے باجوں پر یہ دنیا ناچے
 زندہ ہے ہر تار
 کہ اب گھر لوت کے آجائے
 تیرے بعد نہیں ہے کوئی خون پسینے والا
 ایک اکیلا سب نبستی کا جیون جینے والا
 سب کا کر اُدھار
 کہ اب گھر لوت کے آجائے

تیری اماں لبا تیری شادی کے ارمانے
 دانش گاہ سے چھٹی لے کر واپس آ دیوانے
 سب کچھ ہے تیار
 کہ اب گھرلوٹ کے آجائے
 اب بھی گھروندے بنے ہوئے ہیں کچھی مٹی والے
 کچے کچے ہاتھ ابھی تک ہیں ان کے رکھوالے
 ان کو دے آدھار
 کہ اب گھرلوٹ کے آجائے
 تیرے پالے تو تا مینا مرنے اور کبوتر
 اپنی بولی بھول گئے تیرے ہونھوں کو کھو کر
 گونگا اظہار ہے
 کہ اب گھرلوٹ کے آجائے
 تیرے کرے والی میر اور غالب کی تصویر
 اتر گئی اس کے بدے ہے ایٹ کی تو قیر
 جلدی کر فناکار
 کہ اب گھرلوٹ کے آجائے
 سنتے ہیں کچھ لوگ یہاں ہر پل سوچا کرتے ہیں
 اپنے درد سر کو درد دل لکھا کرتے ہیں
 بگزے ہیں اشعار
 کہ اب گھرلوٹ کے آجائے
 ایک زمانہ چھوٹ رہا ہے ہر دیوار کے پاس
 دیوار و در میں جاگے ہیں نئے نئے احساس
 نئے کو دے آکار
 کہ اب گھرلوٹ کے آجائے

جو آنکھ ہو تو وہی پرانی کتاب دیکھیں
 جہاں سے ہم لوگ کٹ گئے ہیں وہ باب دیکھیں
 تمام آنکھیں پڑی پڑی خاک ہو رہی ہیں
 چلو ان آنکھوں سے کہہ کے آئیں کہ خواب دیکھیں

(۱۹۷۸)

اس کے ہونخوں کے سبق لے کے ہوا آتی ہے
 وہ نبیس آتا مگر اس کی صدا آتی ہے
 دریتک سوچتے رہنے سے ترے بارے میں
 روشنی سی مرے سینے میں پہ کیا آتی ہے

(۱۹۸۳)

میں بے نام و نسب ہوں نام دے دے
مرے مالک ! مرا انعام دے دے
سو نیزے پہ ہے دنیا کا سورج
تو اک نیزے پہ اپنی شام دے دے
لہوکی شاخ کے گم صم پرندے
کبھی مجھ کو بھی کچھ پیغام دے دے
مجھے دنیا کے کام آتے نہیں ہیں
سو اپنے گھر ہی کوئی کام دے دے
ابھی آغاز ہی آغاز ہوں میں
بہت دن ہو گئے انجام دے دے

(۱۹۸۳)

مجھ میں جلتے ہوئے لفظوں کی حقیقت کیا ہے
کون جانے مرے اظہار کی صورت کیا ہے
میں تری آگ میں گھر بار جلا آیا ہوں
میرے مالک ! مرے اقدام کی قیمت کیا ہے
ڈوبتا جاتا ہوں خود اپنی ہی تاریکی میں
جلد دکھلا تری آیات کی صورت کیا ہے
گرمی خاک میں تیرا ہی بسرا ہے تو پھر
درودیوار سپہ دن رات یہ وحشت کیا ہے
تونے ہی مجھ کو بنایا ہے تو پھر یہ بھی بتا
اپنی تخلیق سے تجھ کو یہ عداوت کیا ہے

(۱۹۷۳)

نار سائی

ہزاروں پتوں پر تم کو خط لکھے
 ایک ایک جان پہچان والے سے
 پوچھتا پھرا ہوں
 جتنے منھ تھے اتنی باتیں
 جانے کون ہو؟
 تم کو جانتا نہیں، پہچانتا بہت ہوں
 پتہ نہیں کون سے خواب میں
 کس تاریک لمحے میں
 بے چین بے نیند رات کی کون سی کروٹ میں
 اچانک روشنی ساتم کو دیکھا تھا
 تب سے تم سے محبت ہو گئی ہے
 تمہارا پر سکون بھر پور چہرہ
 اس پر میری پوری پکڑ ہے
 تم کو پانے کے پاگل پن میں
 ساری دنیا کی تاریخ، جغرافیہ
 فلسفے، سماجی علوم
 ادب، شاعری، سارے فنونِ لطیفہ
 سب کچھ جان لیا

میں رونا چاہتا ہوں

تمام زمانوں کی انسانی شکلیں

تم سے ملا تا ہوں

تقدیر کو لکھے ہوئے

آدمی کے سارے محبت نامے پڑھتا ہوں

شاید کہیں تمہارا ذکر ہو

ابھی ابھی تم کو

کسی ہوئی بھیڑ کے آخری سرے پر

دیکھا ہے اچانک

ریلے پر ریلا، دھکے پر دھکا

کہیں بھی کوئی شگاف نہیں

انسانی جسموں کی اوپنجی دیوار

تم تک کبھی بھی

پہنچنے نہ دے گی

(۱۹۸۷)

چاک

اے چاک پہ بیٹھے کمہار ذرا
 مرے بال سکھا
 مجھے درس دیا ہے تو
 لفظ بھی دے
 کوئی ربط بھی دے
 مجھے درد دیا ہے تو
 ظرف بھی دے
 ذرا ضبط بھی دے
 ذرا بھیر دے اپنے کواڑا بھی
 ابھی روک لے اپنی ہواں کو
 ذرا اتحام ندی کی یہ باڑھا بھی
 مجھے ناؤ بنا
 مجھے پیار نہ کر
 مجھے ناؤ بنا
 کہ میں تیرے بہاؤ کو جھیل سکوں
 ترے دشت اتحاہ میں کھیل سکوں
 ابھی میری صد امیرے کان میں ہے
 مگر اس کے پرے
 وہاں کون بتائے گا، اتنی صداوں میں

کون ہوں میں

مرانام ہے کیا

مراکام ہے کیا

مجھے ڈھیل نہ دے

مجھے پیار نہ کر

مجھے گھاؤ بنا

کہ میں درد صداوں میں چلتا رہوں

تجھے چاروں دشاوں میں جلتا رہوں

ابھی دید بھی ہے، ابھی درد بھی ہے

ابھی آگ بھی، خاک نبرد بھی ہے

انہیں گوندھ کے

میر اسکھاؤ بنا

مجھے پیار نہ کر

مجھے چاک چڑھا

کہ میں تیز بھاؤ میں ناؤ بنوں

کہ میں درد صداوں میں گھاؤ بنوں

مجھے حرف ملے

مجھے ظرف ملے

مرانام بنے

مراکام بنے

تجھ سے ہی بھر رہوں

اے لازوال امکانوں کے سراب
 میری حقیقت کے خواب
 اے لامست کے پرندے
 میری دیران ڈال کے معنی
 اے ساری دنیا کی روشنیوں سے پرے
 تیرے وہ دور کے چمک رنگ گھرے
 مجھ کو ستاتے ہیں
 اے وہ بہت دور اور دور اکیلے
 بہت سے چراغوں میں
 جلتے ہوئے شعلے
 اے بہت ہی میٹھی بہت ہی دور کی
 ڈھولک کی تھاپ
 مجھ کو بھی اپنی محفل میں بلاۓ
 اب کی ان آنکھوں کو ایسا ک خواب دے
 جس سے میں لوٹ کے
 واپس نا آسکوں
 تجھ میں ہی ڈوب جاؤں
 تجھ سے ہی بھر رہوں

تجدید

میں اپنی روح کے پھٹے لباس کو
 لیے ہوئے
 کہاں کہاں نہیں گیا
 برہنگی کی شرم کا علاج کس سے ہو سکا
 تمام کائنات میں
 جو شور تھا
 ازل سے آج تک
 جو حرف و لفظ کا غبار تھا
 اسے چھواؤ تو
 صرف خامشی کو ڈھانپنے کی بات تھی
 کسی دکان کی قبا
 نہ میرا ستر بن سکی
 وضو کے واسطے
 سمندروں کا آب خشک تھا
 نماز کے لیے
 زمیں کی کھال بے ستون ملی
 وہ گرد باد آسمان
 خدا کی آیتوں کا ورد
 بے حیات ہڈیوں کو چو سنے کا مشغله
 نہ گوشت کی ہوں

میں رونا چاہتا ہوں
 نہ گوشت خور عشق کی تمپش
 کسی کی آنچ
 برف کی عمار تیں نہ ڈھا سکی
 میں جانتا ہوں
 میرے دست و پا
 تری مسافری میں کٹ گئے
 کہ مرے ہو نہ
 تیر انام بولنے میں نوٹ پھوٹ جائیں گے
 مگر مرے طسم کی کلید
 تیرے ہاتھ ہے
 تو جانتا ہے میر انام اور پتہ
 کہ میرے بھروسہ صل کی زبان تجھ کو یاد ہے
 وہ لفظ تجھ کو یاد ہے
 کہ جس کو سن کے مئیوں کوماں کا درد مل گیا
 مری حقیر ذات، یہ ذلیل زخم جاؤ داں
 درد کا سایہ گراں
 تو اس میں یا تو
 پہلے لفظ کی ذرا سی خاک ڈال دے
 نہ ہو سکے
 تو اس کو اپنی منہیوں میں بھینچ لے
 کہ اب یہ مری انگلیوں سے گر کے ٹوٹ جائے گی

عذاب عن قریب ہے

ضیاء ہے یہ اپنے آپ کا ضیاء ہے یہ صبح و شام چائے میز گفتگو خلامکان بے تکان
 جستجو مکالے یہ کچھ نہیں کہ چشم و ہوش و گوش کی روایتوں کو چھوڑ کر کہاں
 ہو؟ کون سی زبان کا لفظ ہو؟ تمہاری قبر ہو گی یا جلائے جاؤ گے؟ نہیں وہ کوئی بھی
 نہیں جو اپنانام خود رکھے محبیتیں جمالیات تجربے عمیق رات ماہتاب کا سفر گلاب
 لمس خوشبوؤں کی راگنی خدا کی کائنات کو سنوارنے کا حوصلہ یہ سب جزیرہ ہائے
 رقص لامکاں غنوڈگی میں جگنوؤں کی یہ چمک دراز رات درمیان دو چمک نہ
 والدین گھرنہ باردوستی نہ عاشقی نہ سرمدی دراز رات دور دور تک
 دراز تیز تیز آندھیوں کی سائیں سائیں دو چمک کے درمیان مناظرے بلند بانگ
 گفتگو سیاستیں غرور کرو فرانا کی شہوتیں رعنیتیں کہ بزدلو! ڈراؤ اپنے آپ
 کو خشتوں سے کانپ کانپ کر عبادتیں کرو کہ دم بہ دم اذان دواذان دو تمام
 آنسوؤں کے زور سے اذان دو عذاب عن قریب ہے

توڑ دے اس خاک کی دیوار کو

اے بہشتوں کے ستم گر
 اے مری خاک حزیں کے رازدار
 اے میری آوازوں کے رہن
 میں تیرے دروازے کا سائل
 تیرے غمزوں کا شکار ناتواں
 کب ترے سجدوں سے میں نے سر کشی کی
 کب ترے جور و ستم سے سراٹھایا
 تو ہی ناشکرا
 رقیبوں کے حوالے کر دیا مجھ کو
 اب دیکھے تیرے جرم نے
 کیا گل کھائے ہیں
 تری دنیا کے کیڑے
 رات دن اب اس بدن کو چاٹتے ہیں
 آج بھی جس پر ترے بے باک بوسوں کے نشاں ہیں
 مال وزر کی، عورتوں کی خواہشیں

میں رونا چاہتا ہوں

ہوس کی سوکنیں
 مجھ کو نچاتی پھر رہی ہیں
 لپلپاتی لاچتی لمبی زبانیں
 رینگتی ہیں
 انگلیاں بازار کی
 گردن کے چاروں اور
 سختی سے جمال
 چیخنا دشوار گم صوت و صدا
 تیرا چہرہ بھی نظر آتا نہیں مجھ کو
 بہت اوپھی ہوئی ہے خاک کی دیوار
 میری اتجابہ
 اے مرے بچپن کے ساتھی
 اے ازل کی تسلیوں کے شوخ لڑکے
 کھول اپنے روزنوں کو
 اپنے چہرے کی ذرا سی آگ
 اپنے جسم کی تھوڑی ملامت
 اپنی آوازوں کی ہلکی نغمگی
 پھر میری مشی میں ملادے
 توڑدے اس خاک کی دیوار کو

بے گواہ دکھ

اے کائنات کے سفاک سنائے
 اے تاریخ کے تاریک زمانوں کے
 متحده راہ نامے
 اے مکمل ماپوسی میں تنکے کے سہارے
 اے گمنام دکھوں کے بے سہارا آنسو جذب
 کرنے والے وہم شفقت
 اے سب کچھ! اے کچھ بھی نہیں
 میں تیرے تمدنوں کو نہیں مانتا
 ان پہچانوں کو نہیں مانتا
 جو تو نے مختلف گروہوں کو
 کھلونوں سی دے رکھی ہیں
 تیری عبادت کے سارے طریقوں کی
 تردید کرتا ہوں
 ہاں میں تردید کرتا ہوں
 تجھ تک پہنچنے کے مروجہ راستوں کی
 میرے پاس وہ کچھ بھی نہیں
 جو تیرے خوشامدیوں کے بقول
 تجھ کو پسند ہے

میں رونا چاہتا ہوں
 میرے پاس خوش رنگ الفاظ نہیں
 خوش انجام کارنا مے نہیں
 صرف ایک دکھ ہے
 ایک بے گواہ دکھ
 وہ دکھ ہے جس کے سب
 میرے قبضے میں
 دنیا کی مرغوب شخصیت نہیں
 رزق آفریں علم نہیں
 جس کے سب
 میں نکما، ناکارہ، کابل اور بخش ہوں
 وہ دکھ ہے
 جو تیرے طسم کے جنگلوں میں
 تجھ تک پہنچنے کی
 خفیہ پگڑندی ہے
 تجھ سے ڈھکی ہوئی ہے
 وہ دکھ
 جو ہمیشہ سوچتا رہتا ہے
 حیران رہتا ہے
 اور کبھی کبھی
 روئے لگتا ہے

وہ دکھ

جو تشکیک کی آگ میں پانی کی ہتھیلی
 جو ذلیل ہونے سے پہلے کی واپسی
 بکنے سے ذرا در پہلے کی ملامت ہے
 یہ دکھ میرا استثنامیری قناعت ہے
 اسی کی دھار سے
 ترے چاروں طرف اگی ہوتی
 جھاڑیوں کو کاشتا ہوں
 لیکن یہ کیسی محرومی ہے
 آج تک
 ویسا ہی چھوٹے کا چھوٹا ہوں
 میرا دکھ بے وقار
 میری اذیت بے مآل

(۱۹۷۸)

اس شہر پر اب کوئی بلا تک نہیں آتی
 ہم ایسے مُرے ہیں کہ قضا تک نہیں آتی
 تنهائی کی کس منزل دشوار میں ہوں گے
 ہم لوگ جنہیں یاد خدا تک نہیں آتی
 کس طرح وہ خود آئے کہ جب اُس کی طرف سے
 ٹوٹا ہے پل ایسا کہ ہوا تک نہیں آتی
 دن اتنے اندر ھیروں میں گزرتا ہے ہمارا
 پچھے روشنی فجر عشا تک نہیں آتی
 اس نور کے پیکر کا طلب گار ہوا ہے
 اس خاک کے پتلے کو حیاتک نہیں آتی
 دریا میں پھر اک راہ بنادینے کی تدبیر
 سینے میں تو ہے نوک عصاتک نہیں آتی

وہ ایک اکیلا چاند کہاں یہ رات بھیانک کالی ہے
 ہم جسے تنہا لوگوں کو اللہ بہت ناکافی ہے
 کیا جادو نگری جیسی ہے یہ رشتے ناتوں کی دنیا
 گھر کے اندر بھی کوئی نہیں گھر کے باہر بھی خالی ہے
 کل رات ہوا کے جھونکے سے محبوب کا دامن چھوٹ گیا
 پھر چاند بجھا پھر رات بڑھی پھر رات بڑھے ہی جاتی ہے
 احساس مسلسل رونے کا اور خوف کبیں گم ہونے گا
 جب ڈھارس کوئی نہ دے پائے وہ رات بھی آنے والی ہے
 یہ شہر میں کیسی بھگڑ ہے کیا کوئی نئی بپتا ٹولی
 سب لوگ کہاں کو جاتے ہیں اب کون نگر کی باری ہے
 سب ڈھونڈ رہے ہیں دنیا میں فرحت احساس کہاں ہوگا
 وہ ڈھونڈ رہا ہے دنیا کے باہر جو ذرا ہریالی ہے

(۱۹۷۶)

گناہوں کی دھندر

اپنی دعاؤں کے زخمی پیروں سے
 چلتا جاتا ہوں
 اور یہ کانٹے دار راستہ
 اس ویران مسجد تک جاتا ہے
 جس کے تمام گنبد و محراب
 میرے گناہوں کی دھندر میں
 ڈوبے ہوئے ہیں

(۱۹۷۸)

صحح کا ذب

بڑے بڑے موحد
 لا الہ کے ورد انداز
 لا شریک لہ کے تسبیح گزار
 قائم اللیل
 صائم النہار
 مگر اور لیکن سے ٹھوکر کھاتے ہی
 مشرک ہو جاتے ہیں
 ہماری مسجدیں
 مگر اور لیکن
 کے پتھروں سے بنی ہیں
 متوفی لوگوں کی عبادت گا ہیں
 نیند کی ہوتی ہیں
 صلات اور خیر من النوم کا رشتہ
 صحح کا ذب نے کاٹ دیا ہے

واعظ

”اور تبھی ایک آواز گوش انگیز
اعصاب پر طاری ہوئی، ہفت افلاک پر تحری طاری ہوئی
ایک پری پیکر، عشوہ وادا سے منور، حوروں کے بازوؤں پر،
سُبک خرام، اترتی ہے سوئے زمیں، رفتہ رفتہ...“

واعظ نے دم لیا / چاروں طرف
اوس میں بھیگی زمین پر سامعین
سوئے پڑے تھے /

رات کی سیاہی حسب معمول
پہلی ہوئی تھی

”اف! یہ تو سو گئے، کم بخت“

ان کے چہروں پر پچھلے دنوں کی تمحکن اور اگلے روز کی محنت
تابندہ ہو گئی تھی / کسی کے ہونٹوں پر شرمندہ سا غیم
کسی پر خجالت / کبیں

پر افتخار اور یوں ہی بہت سا

جیسے کوئی خواب اندر ہی اندر دیکھا جا رہا ہو

”آج کی رات بیکار چلی گئی“

ان کی اصلاح ممکن نہیں، بد بخت دہقان!“

جب وہ لفظوں کی آخری سیر ہی پر پاؤں دھر رہا تھا

اس نے دیکھا نہیں / پاس ہی

نہ سفید سا ایک گلاب

سیاہ پیوں سے سرا بھار رہا تھا

سورج کے گھر کا چولہا

ہوا

گلابوں کی پتیوں
اور تسلیوں کے پروں کو
سوکھی ہوئی فرومایہ ٹھنڈیوں کو
تمام روئے زمیں پ
خلق خدا کے
بے کار و بار سائے
تمام آبادیوں کی بیکار
سادہ کاغذ کی رذیوں
اور ساری کھوئی ہوئی صداؤں کی دھجیوں کو
اکٹھا کرنے میں منہمک ہے
کہ ان سے
سورج کے گھر کا
چولہا جلا کرے گا

دن ہونے کا منتظر منظر

ناچتی ہے گھاس کی پتی پر شبم کی پری
 سونے والے دیکھ بیتی جاری ہے زندگی
 نرم شاخوں پر پرندے حمدِ رباني کریں
 بزر پتوں میں ابھی ابھی ہوتی ہے چاندنی
 آسمان پر ٹھیماتے دھیمے دھیمے سے چراغ
 مض محل ہوتی چلی جاتی ہے جن کی روشنی
 ہر کلی کے شیرخواروں کو جگاتی ہے ہوا
 نور کی تھالی پر دیتی ہے کٹوری دودھ کی
 تنلیاں پھولوں سے کرتی پھر رہی ہیں چھیڑ چھاڑ
 جھاڑیوں سے آرہی ہے ان کی روپیلی بُنی
 پھول کھلتے جا رہے ہیں صبحِ صادق کے لئے
 نم ہوا میں چومتی پھرتی ہیں ایک اک پنکھڑی
 صبح کے اجلے پروں سے بھرتی جاتی ہے فضا
 گھنٹیوں کی اور اذانوں کی صدا روشنی ہوتی
 دھیرے دھیرے مشرقی رخسار کا بو سہ کھلا
 پتمنی چہرے پر چھائی دھنڈ کی چادر ہٹی
 دھیرے دھیرے شہر کے آثار ظاہر ہو گئے
 ہر درو دیوار میں ہونے لگی اک کھلبی
 لوگ دروازوں پر مال اسباب لے کر آگئے
 ہر گلی کوچے سے آواز جرس آنے لگی
 دھیرے دھیرے ہر دکاں کے بادباں کھل جائیں گے
 شہر یچے گا خریداری کریں گے آدمی

سفید قصہ

خوابوں میں جگا ہوا وہ چہرا
 آنکھوں میں گھلا ہوا سوریا
 راتوں میں وہ دور تک سفیدی
 آنکھ شہزادے چاند گھرا
 شاخوں پر وہ اوس کی پھواریں
 آگتا ہوا پیڑ سا گھنیرا
 کہسار پر بجلیاں رکی سی
 پانی میں پہاڑ کا اجالا
 گنار ۲۰ سرگوشیوں کے چہرے
 اور بام پر نور سا چھلاؤا
 دو سرخ چراغ جیسی پھانکیں
 دونوں پر لہو کا گرم دھارا
 اور خون میں دھوپ کی پھواریں
 اور دھوپ میں تر گلاب گھرا
 گلاب پر شہد کی دکان سی
 دکان پر تسلیوں کا گھیرا
 خوشبو کے وہ رنگ تسلیوں پر
 رنگوں سے بنا ذرا سا بچہ
 بچہ کی زبان پر دودھ پریاں
 پریوں کی زبان سفید قصہ
 قصے کا بیان خواب جیسا
 سنتا ہوا شب بیدار بچہ
 خوابوں میں جگا ہوا وہ چہرا
 آنکھوں میں گھلا ہوا سوریا

دنیا کو کہاں تک جانا ہے

دنیا کو کہاں تک جانا ہے
 یہ کتنا بڑا افسانہ ہے
 سب کان لگائے بیٹھے ہیں
 اور رات سرکتی جاتی ہے
 یہ رات کہاں تک جانی ہے
 کچھ اس کا اور و چھور نہیں
 یہ رات سمندر ہے جس میں
 آواز بہت ہے رونے کی
 بس دور تک تاریکی ہے
 کچھ دور ذرا سی روشنیاں
 پھر تاریکی پھر روشنیاں
 یہ رات بلا کی مایا ہے
 جو کچھ کا کچھ کر دیتی ہے
 آنکھوں کو جگاتی ہے برسوں
 پھر نیند کا دھکا دیتی ہے
 پھر خواب دکھاتی ہے برسوں
 پھر خوابوں سے چونکاتی ہے
 یہ کھیل بھیانک راتوں کا

انسان کی نہیں ذاتوں کا
 خوش ہونا اور دہل جانا
 پھر آنسو آنسو گل جانا
 اس کھیل میں جو بھی ہار گیا
 پھر مٹھی سے سنوار گیا
 اس کھیل میں پھنسنا پیارے
 بس ہاتھ میں جتنی مٹھی ہے
 اس مٹھی سے سنوار بننا
 اسے اپنے آنسو کا پانی
 اسے اپنے بھر کی گرمی دے
 اسے موسم موسم نرمی دے
 اسے اپنے انگ لگا پیارے
 اسے اپنے رنگ لگا پیارے دنیا
 دنیا کو کہاں تک جانا ہے
 یہ کتنا بڑا افسانہ ہے
 یہ بھید نہ کوئی جان سکا
 اس بھید کا چکر بھاری ہے

کھوئے ہوؤں کے نقش پا

کھوئے ہوؤں کے نقش پا
 پھر مری رہ گذر میں ہیں
 پھر مرے دل کی سیدھی میں
 دور خلا کے موڑ تک
 دھنڈ کارستہ بنا
 دھنڈ کے راستے میں پھر دھیمے چراغ جل اٹھے
 زرد سی روشنی میں چند چہرے نمودزیر ہیں
 چہروں کے سارے خط و خال بڑھتے گئے شجر ہوئے
 ایک شجر کہ ایک شاخ بھر ہے، اک وصال ہے
 ایک میں بے پنه خوشی، شاخ دگر ملال ہے
 کاش کہ یہ شجر چلے
 دھنڈ کی رہ گذار سے
 ٹھوس زمیں سے آگے
 پھر مری آنکھ میں کھلے ایسا جہاں دو جہاں
 جس میں وہ سارے لوگ ہوں
 دید سے اور ندید سے
 جس میں تمام گھر سفر اور تمام بحر و بر
 جس میں تمام دین و دہر اور تمام دشت و شہر
 سبزہ یک نگاہ ہوں
 پھر مرے خاک آئئے، نور کی عکس گاہ ہوں

رات کا جادو

اٹھو کہ رات کا جادو جگا رہا ہے تمہیں
 دبے سروں میں کوئی گیت گا رہا ہے سنو
 اٹھو کہ ساحر شب نے غلاف کھول دیے
 تمام خواب اذیت کے سرد خانوں سے
 نکل رہے ہیں دبے پاؤں سر جھکائے ہوئے
 وہ درد آگ سی روشن ہے بیچ بستی میں
 دبیں یہ خواب کے پیکر نہائیں گے شب بھر
 ابھی یہ رات چراغوں کے ناق تاچے کی
 تمام رات کی تحالی میں نور جل ہو گا
 اتر رہے ہیں اجائے پلک پلک تم پر
 فضا میں دودھ سے پنکھوں کی سر سراہٹ ہے
 چک رہی ہے وہ شفاف رات کی رانی
 پلک رہے ہیں لوؤں سے سفید راجملار
 بجا کہ جسم بہت تھک چکا ہے دن بھر کی
 تمازتوں میں نگاہیں بھی جل چکی ہیں مگر
 ذرا سی دیر کی مہلت ملی ہے دنیا کو
 بس ایک پل کے لیے کائنات جاگی ہے
 اٹھو اگر تمہیں نچھڑے ہوؤں سے ملنا ہے
 اٹھو کہ نیند میں دیکھے ہوئے کوچ کرلو

یہ استعارہ نہیں بنے گا

نہیں بنے گا

یہ استعارہ نہیں بنے گا

یہ اب نہ ہو گا

کہ تم کبھی چاند کو پکارو

تو کوئی معصوم چونک اٹھے

یہ اب نہ ہو گا

کہ ایک بچے کی انگلیوں سے

گلاب دے کر کتاب لے لو

گلاب ٹہنی سے

اور خوشبو سے چھوٹتے ہیں

مطابے ہیں

کہ ٹہنی، خوشبو، گلاب

اپنے ہی نام سے اب پکارے جائیں

کہ موسم الوداع

ملنے کا

استعارہ نہیں بنے گا

میں رونا چاہتا ہوں

سوچنا بے دست و پا ہے

ذہن میں اب کچھ نہیں ہے

ایک سنانا

کہ جس کو لفظ میں کچھ کہہ نہیں سکتے
دیکھنے کو سوچنے کو کچھ نہیں

سمنا بچا ہے

اپنے ہی کٹتے ہوئے اعضاء کا شور

ایک دریا بہہ رہا ہے

اور اس پر ایک پل نوٹا ہوا

اور پل پر کچھ گھڑے سوراخ پیندا

قطرہ قطرہ ان کا سب کچھ

آسمان سے اس زمیں پر ایستادہ

میں یہاں ہوں

اس طرف

مال باپ کی تختندی کراہیں

ایمر جنسی وارڈ سے چھتنا ہوا نیلا غبار

دھان کے کھیتوں میں اترے مست دہقانی ہجوم

ایک شاعر نشہ اوہاک میں ڈوبا ہوا

نیند کے آغوش میں جاتا ہوا وہ آخری کتا

اذان فجر کے ٹھوکے سے حیراں پیر خستہ تن

سپاہی جیل کا بچائیں مقفل کر کے اندر کی طرف جاتا ہوا

زندگی کی منتشر شکلیں مری تو حید میں یکجا

اگر میں سب کو لے کر ڈوب جاؤں

رات کے گھرے سمندر میں

تو پھر دنیا کہاں ہوگی

مگر یہ سوچنا بے دست و پا ہے

اگر میں چینوں

اگر میں چینوں

میں اپنے دل کی تمام تنہائیوں سے چینوں
تو کائناتی نظام میں کیا خلل پڑے گا

یہی کہ

اندھے کنوئیں سے اک بازگشت ہو گی

کہے گی کیوں تم کو کیا ہوا ہے؟

تمہی بڑے آئے ہو کہیں کے

یہ آسمان و زمیں

یہ سورج یہ چاند تارے

تمام ماں باپ سارے اجداد

شہر کے سب شریفزادے

انہیں بھی دیکھو

یہ سب مصیبت زدہ، متناہت سے

بردباری میں سہہ رہے ہیں

تمہی میں برداشت کی کمی ہے

اگر میں چینوں تو

میری آواز بھی ملامت کرے گی مجھ کو

وہ سب کہیں گے

میں رونا چاہتا ہوں

کہ کون یہ شور کر رہا ہے
ہماری نیندیں اچانٹ کر دیں
اگر میں چینوں
تو سارا امن و سکون
نظم اور نت
مجھ کو خلاف قانون، دشمن خلق کہہ کر
صلیب دے گا
مگر یہ چینوں بھرا ہوا دل
کسی بھی لمحے
مجھے کہیں خوفناک را ہوں پڑال دے گا
صلاح دے گا
کہ زور چینو
کہ جسم کے ساتھ
روح بھی سرد ہو گئی پھر
تو کیا کرو گے

پھر وہی چاند وہی رات کہاں سے لاوں
 اس سے دوبارہ ملاقات کہاں سے لاوں
 اس کے ہو نٹوں کی دکاں بند ہوئی ہے جب سے
 میں ہوں خاموش کہ اب بات کہاں سے لاوں
 جاگتا رہتا ہے دن رات دکھوں کا سورج
 نیند آتی ہے مگر رات کہاں سے لاوں
 فاقہ کرنے سے فقیری تو نہیں مل جاتی
 نگ دستی میں کرامات کہاں سے لاوں
 مجھ کو ورثے میں ملا ہے یہ خزان کا موسم
 زرد ہو نٹوں پہ ہری بات کہاں سے لاوں
 آسمان میرا زمیں سے بھی گیا گزر رہے
 اب بلندی کے مقامات کہاں سے لاوں
 اے غزل ! درد کی رو داد ہے تفصیل طلب
 اب کنیات و اشارات کہاں سے لاوں

آیا، ذرا سی دیر رہا غل، گیا بدن
 اپنی اڑائی خاک میں ہی ڈل گیا بدن
 خواہش تھی آبشار محبت میں غسل کی
 ہلکی سی اک پھوار میں ہی گھٹل گیا بدن
 زیر کمان دل تھا تو تھوڑی تھی امید
 اب تو ہمارے ہاتھ سے بالکل گیا بدن
 اب دیکھتا ہوں میں تو وہ اسباب ہی نہیں
 لگتا ہے راستے میں کہیں کھٹل گیا بدن
 میں نے بھی ایک دن اسے تاراج کر دیا
 مجھ کو ہلاک کرنے پہ جب ٹل گیا بدن

(۱۹۹۲)

زمیں کی سوچ کا نقش کہن لوگ
 جپیں خاک پر مثل شکن لوگ
 یہاں زار و قطار آتے رہے ہیں
 مسلسل آنسوؤں سے بے سخن لوگ
 بے رنگ خاک اڑتے پھر رہے ہیں
 ترے کوچے میں تیرے پیر ہن لوگ
 نہ جانے ان کی مٹی ہے کہاں کی
 کہاں جا کر رکیس گے بے وطن لوگ
 ہمیں گھر سے نکالے دے رہے ہیں
 بہت ناراض ہیں اہل وطن لوگ
 انہیں رشتے ملے تنہائیوں کے
 جو اپنی ذات کے تھے انجمن لوگ
 زمانے پر بلا خورشید ہیں وہ
 خود اپنے آپ پر سورج گہن لوگ
 تمہیں کیا ہو گیا احساس صاحب
 تمہی پر تکیہ کرتے تھے اپن لوگ

ہر گلی کوچے میں رونے کی صدا میری ہے
 شہر میں جو بھی ہوا ہے وہ خطہ میری ہے
 یہ جو ہے خاک کا اک ڈھیر بدن ہے میرا
 وہ جواڑتی ہوئی پھرتی ہے قبا میری ہے
 وہ جو اک شور سا براپا ہے عمل ہے میرا
 یہ جو تہائی برستی ہے سزا میری ہے
 میں نہ چاہوں تو نہ کھل پائے کہیں ایک بھی پھول
 باغ تیرا ہے مگر باد صبا میری ہے
 ایک ٹوٹی ہوئی کشتی سا سا بننا بیٹھا ہوں
 نہ یہ مٹی، نہ یہ پانی نہ ہوا میری ہے

(۱۹۹۲)

لوگ یوں جاتے نظر آتے ہیں مقتل کی طرف
 مسلکے جیسے روانہ ہوں کسی حل کی طرف
 میں ہوں اک لفظ ترستا ہوں مگر معنی کو
 رشک سے دیکھتا ہوں تابع مہمل کی طرف
 شہروالے ہی کبھی کھینچ کے لے آتے ہیں
 جی مرا دردہ اڑا پھرتا ہے جنگل کی طرف
 بے خبر حال سے ہوں خوف ہے آئندہ کا
 اور آنکھیں ہیں مری گزرے ہوئے کل کی طرف
 وہ اداسی ہے کہ سب بت سے بنے بیٹھے ہیں
 کوئی ہاچل ہے تو بس شہر کے پاگل کی طرف

(۱۹۹۳)

میں بچھڑوں کو ملانے جا رہا ہوں
 چلو دیوار ڈھانے جا رہا ہوں
 کروڑوں خشک لب ہیں ساتھ میرے
 سمندر کو سکھانے جا رہا ہوں
 مسلسل آنسوؤں کی فوج لے کر
 میں سورج کو بجھانے جا رہا ہوں
 ادھر کچھ لوگ کب سے رو رہے ہیں
 انہیں ڈھارس بندھانے جا رہا ہوں
 ادھر مرہم لگا کر آرہا ہوں
 ادھر مرہم لگانے جا رہا ہوں
 یہ دنیا ب کسی قابل نہیں ہے
 قیامت کو بلانے جا رہا ہوں
 یہاں ملنا ملانا کچھ نہیں ہے
 مگر میں خاک چھانے جا رہا ہوں
 جنہیں چہرہ بدلتا ہو بدلتیں
 میں اب پردہ اٹھانے جا رہا ہوں

(۱۹۸۲)

اصفافے

بُسا اپنے بھلے لگو کی راکو لے تر
 بُسا اگ لگو بناتے جا رہا ہوں
 اُزُل کی صدر توں والی دکاں سے
 سُئ پہیاں لاتے جا رہا ہوں

آنکھیں
 دل اور دماغ
 گر دے، جگر اور تنی
 ان سب کو
 دونوں ہاتھوں میں لگالو
 ان کا اصل مقام یہی ہے
 افادہ، استعمال، ترقی
 میرے عزیز!
 ترقی

رخصت

انقلاب کیا ہوتا ہے، ابا!
 کیا! انقلاب؟
 اس نے اس تھی سی جان کو سر سے پاؤں تک دیکھا
 پھر رونے لگا
 بھیگلی ہوئی آنکھوں سے
 بچے کو اوپر سے نیچے اور
 اندر سے باہر تک
 چھو تارہا
 جیسے وہ ہاتھوں سے چھوٹا جا رہا ہو

دھندرکا

میں بھی حسین ہو

اگر

روشنیوں کی زد میں ہوں

اور

فضا میں دھند ہے

(۱۹۷۸)

آغاز کی تاریخ

اک مسافر ہوں
 بڑی دور سے چلتا ہوا آیا ہوں یہاں
 راہ میں مجھ سے جدا ہو گئی صورت میری
 اپنے چہرے کا بس اک دھندا لتصور ہے میری آنکھوں میں
 راستے میں میرے قدموں کے نشان بھی ہوں گے
 ہو جو ممکن تو انہیں سے
 مرے آغاز کی تاریخ سنو

بَاہر بَاہر بَاہر

نہیں
 تم شاعر نہیں
 بحر و وزن، بد لع و بیان ناواقف
 مخرب اخلاق
 لاولد، بے ارث
 اپنے بن بیا ہے اشعار دیکھے ہیں
 بَاہر، بَاہر، بَاہر
 تم نے ہی دنیا کو بگاڑا ہے

(۱۹۷۹)

غور

وہ نہیں جانتے
 کہ ان کے دونوں ہاتھ
 ان کی پشت پر بند ہے جیس
 اور
 ان کو اپنے سینے کے تناؤ کا غور ہے!

(۱۹۷۸)

ایڑیاں

عجب سماں ہے
 کہ سارے چہرے
 خود اپنے اندر
 الٹ گئے ہیں
 تمام جسموں کی خاک میں
 ایڑیاں گڑی ہیں!

(۱۹۷۹)

تم نہیں مانے

سوچو

پھر ایک بار

غور سے

جب تم پیدا ہوئے تھے

تمہاری ماں کتنا پھوٹ کر روئی تھی

لیکن

تم نہیں مانے

(۱۹۷۹)

ہمواری

سورج

میرے ایک پاؤں کا جوتا ہے
 دوسرے پاؤں کا جوتا چاند
 ان سے راتوں اور دنوں میں
 لنگڑا تا چلتا ہوں میں
 کاش میں اپنے
 دونوں جوتے ساتھ پہنتا
 پھر کتنے آرام سے چلتا

(۱۹۷۹)

پیش و پس

اس کے آگے سناثا ہے
 وہ کالا ہے
 اس کے پیچھے اک چہرہ ہے
 وہ پیارا ہے
 وہ اپنی پیٹھ پہ اپنی آنکھیں باندھے جاتا ہے
 ایک پاؤں آگے کی جانب
 دوسرا پیچھے جاتا ہے

(۱۹۷۹)

پیچھے کم از کم نقش پا ہے

میں نے تو
 اپنی آنکھوں کو
 اپنی پشت پہ باندھ لیا ہے
 سامنے دیکھنا اور نہ دیکھنا
 اک جیسا ہے
 پیچھے کم از کم
 نقش پا ہے

(۱۹۷۹)

پیلا کتنا

میرا پیلا کتنا

میرے سامنے والے زرد پھاڑ کو جانتا ہے

ہر پھر کو پہچانتا ہے

صحیح سویرے

میرے ہاتھوں اور پاؤں کو

اپنی پیٹھ پہ لادتا ہے

میری دونوں آنکھوں کو اپنے بالوں سے ڈھانپتا ہے

پھر اپنی پونچھ کو میرے دل کے کھٹکے میں اٹکا کر

زرد چڑھائی ناپتا ہے

(۱۹۷۹)

تو لیہ اور گھر
 میرے گھر کے تو لیہ کا
 اور
 میرے جسم کا رشتہ پرانا ہے
 کہ اس میں
 غسل سے پہلے کی اور ما بعد کی
 سب سو کھی گیلی
 خوشبو میں آباد ہیں
 میں بھی اس کو سو نگھ کر
 پہچان جاتا ہوں کہ
 میرا گھر کہاں کس حال میں ہے
 گریہ سو کھا ہے تو
 بیوی اور بچے
 خوش نہ ہونے کے پیسے میں نہائے ہیں
 جو گیلا ہے
 تو سمجھ گھر مرا
 پکنک منا نے کو گیا ہے

آزادی کا منظر

مجھ میں سے ہو کر
 وہ کارواں گزرتا ہے
 ازل سے ابد تک کا
 ہرے ہرے پتوں کا
 کھلے ہوئے پھولوں کا
 ٹھنڈی ہواں کا
 پر نور سایوں کا
 اور میں اس گھر میں سے
 آنکھوں کو کھڑکی سے
 ان سب کو دیکھتا ہوں
 چلاتا چختا ہوں
 لیکن کوئی بھی نہیں ٹھہرتا
 میری زنجیروں کو
 کوئی بھی نہیں کھوتا

فراموشی

چائے کی کیتیلی بھاپ دینے لگی
 میز پر پیالیاں
 جیسے سویا ہوا ایک کنبہ
 انہیں کیا ہوا
 کیا خبر آگئی؟
 کیا کوئی شہر میں حادثہ پھر ہوا
 یا کوئی مر گیا
 یا کہ آباء و اجداد کی یاد آئی
 کہ اپنی ہی کوئی کمی کھل گئی
 کیا ہوا؟
 کوئی اٹھتا نہیں
 چائے کی کیتیلی بھاپ دینے لگی

(۱۹۷۶)

از کار رفتہ

ٹوٹے پھوٹے برتنوں کے پھیری والے نے
 پکارا
 گھر کے سارے لوگ
 ہر کمرے میں
 ٹوٹے باسوں میں
 میز کر سی کی درازوں
 بستروں میں
 غسل خانوں اور
 گرد آلو دبک شلفوں میں
 کیا کیا ڈھونڈنے میں منہمک ہیں
 گھر میں پرانا کچھ نہیں ہے، اور غصے میں
 اچانک کوئی ٹوٹا آئینہ ایسا نکلتا ہے
 کہ سب محسوس کرتے ہیں
 کہ ہم از کار رفتہ ہیں
 ”تو کیا ہم پھیری والے سے کہیں
 ہم کو، ہمارا گھر بدل دو گے؟“

غسل

دفتر سے جب بھی وہ دیر سے آتی ہے
 گھروالوں کے خاطر تختے لاتی ہے
 شال اوڑھا دیتی ہے اپنی امی کو
 اپنے ڈیڈی کو سوئٹر پہناتی ہے
 اور کچن میں افسرداہ سی بھا بھی کو
 نہلا کر تازہ سائزی بندھواتی ہے
 اپنے ناکارہ بھائی کے کمرے میں
 ایک نیا جوڑا جوتے لے جاتی ہے
 چھوٹے بھائی کو ڈھیروں بوسے دے کر
 کھانوں اور کھلونوں سے چکاتی ہے
 پھر برسوں کی پالی پوسی یینا میں
 اپنا مشترکہ نغمہ اکساتی ہے
 اور انگنانی میں چمپا کے پودے میں
 مر جھائی کلیوں کی سانس جگاتی ہے
 اپنے سارے گھر کے دیوار و در کو
 چھو کر اپنی آنکھوں کو سمجھاتی ہے
 اور پھر اپنے گھروالے کپڑے لے کر
 غسل کدے کے سینے میں چھپ جاتی ہے
 اپنے محروم آئینے کی آنکھوں میں
 اپنی عربیانی کی فتمیں کھاتی ہے
 ڈھیروں اس پر پانی پڑتا رہتا ہے
 دھل جاتی ہے پھر بھی اور نہاتی ہے

ایک بھیانک منظر

سورج کے اس شہر میں آکر
کوئی سلامت نہیں بچا
لوہا، سنگ و خشت اور گوشت
پکھل گئے

ان کے پیچ کا خط فاصل لا موجود
روئے زمیں پر پھیل رہا ہے
بے کردار عناصر کا مردہ سیال
کوئی سانس نہیں لیتا
بدبوؤں کا ایک منارہ قائم ہے
زیرِ ناف انسانی حصے
تلہوں میں دل گردے باندھے
دائرہ مردار کشی میں گھوم رہے ہیں
چاروں سمت ہو س کھساری دروازے ہیں
جن پر زہر لیے سانپوں کے آویزے ہیں
اس دلدل سے دور کہیں وہ ممنوعہ دروازہ بھی ہے
جس میں کوئی پھول کھلا ہے
جس پر ایک سفید پرندہ گاتا ہے
صبح و شام کی چٹانوں کے پار مگر
اس کا رستہ ہے

انکشاف

شہد کی بکھیاں

اب جدید اسلحے لیس ہیں

ایک مدت پر وہ

اپنے چھتے کی جغرافیہ اور تاریخ واقف ہوئیں

یاد آئیں انہیں

اجنبی دست اندازیاں

خشتم بردار پر چھائیاں

”دوستو! ہم بھی نادان تھے

ساری دنیا کو اپنا سمجھتے رہے

موم کی سرحدوں پر

یہ معصوم سے زہر کے اسلحے

دشمنوں کے لیے کوئی مشکل نہ تھے

اس لیے آج تک

معدنِ قومِ لٹتی رہی“

شہد کے چھتے میں اب

تحریک آزادی چلا لی جا رہی ہے

معدنِ قومی کی عصمت کے لیے

سرحدوں کی سالمیت کے لیے

فوج کے دستے معین ہو گئے

موم کے پتلے پس دیوار آہن ہو گئے

تمہاری پکڑ میں نہیں آؤ گا
 تواب بس یہی ایک صورت پنجی ہے
 کہ اک نیزہ لو
 اس پر چم لپیٹو
 اسے میرے سینے میں
 دل کی جگہ گاڑدو
 اور خوش ہو
 کہ انسان کو
 اپنے زیر نگمیں کر لیا

مگر میں تمہاری پکڑ میں نہیں آؤ گا
 خون کی دھار کو
 جوازی کی پہاڑی سے پائے ابد تک
 کسی تنہ چشمے کی رو
 تم اسے کس گھڑی، کس جگہ سے
 حراست میں لو گے
مرادل کوئی خون میں تر پرندہ نہیں ہے

کہ بیٹھا رہے
گوشت کا صرف اک لو تھرا بھی نہیں
جو تمہارے درندوں کا راتب بنے

وہ تو سایہ ہے
اُس دور اڑتی ہوئی سرخ رفتار کا

تم مری لاش لو
موت کی سرحدوں میں اضافہ کرو
تم مرے پانہ مالی بدن کے تعفن
مرے سر کے لاچار سجدوں
مرے پیٹ کی بے بسی اور
گھٹنوں سے رستے ہوئے خون کی بزدلی کے سوا
کچھ نہیں پاؤ گے

(۱۹۷۹)

قطط اور عاشق

وہ پر شکوہ عبارت
جواب تک لکھی نہیں گئی

اس پر
میرے ہو نھلوں کی مہر ثابت ہے

جب بھی انسان بولتا ہے
تاریخ جھوٹی ہو جاتی ہے
—
وہ راستہ

جو جنگلوں سے چل کر
شہروں سے ہوتا ہوا
جنگلوں تک جاتا ہے
اب تک پورا نہیں ہوا
آہن کارخانوں میں

مزدور
زنجیریں اور آریاں بنانے میں لگے ہیں
زننجیر، آری اور مزدور کی انگلی
ایک ہی گھاٹ کا پانی پیتی ہیں
شہر پر امن ہے

جادو نہیں جگا
 ابھی وہ انگلی نہیں انھی
 لہو کا سارے بختے ہی
 مردوں کی شہو تیں
 بیویوں کے حرم سے آزاد ہو جائیں گی
 بستر کوچ کا سامان کریں گی
 خون مکانوں کی پیچھے
 اگی ہوئی جھاڑیاں
 حواس کو زخمی کر دیں گی
 آنکھوں میں نادیدہ منظر وال کا دھنوال
 دلوں میں ان دیکھے لمس کی خارش
 سروں کے ڈھلنے ہٹا کر
 باہر نکل آئیں گی
 جب بھی دنیا کے
 مستقیم ہو نہوں سے
 متدار آوازیں آزاد ہوتی ہیں
 قحط کے مارے
 عاشق ہو جاتے ہیں

و حشیوں کی فوج

پھر یہی ہو گا
 کہ تمہی خون کی اک بوند
 ساری درس گا ہیں پھونک دے گی
 اور یہ بے خواب و خورچو ہے
 تمہاری لا بصری می پر چڑھے
 الفاظ کے پردے کتڑ دیں گے
 تمہارے منہ کے سب لقئے
 غذا بننے سے پہلے ہی
 لبوں سے لوٹ جائیں گے
 تمہارے پیٹ میں بس ایک دنیا سے بھی خالی آنت ہو گی
 وہم کے اس مقبرے میں
 جسم و جاں کی جنگ جاری ہے
 کہیں ایسا نہ ہو
 یہ دیدہ بیدار مردے
 اپنے قبرستان سے باہر نکل آئیں

کہ ہر بستی میں ذکی موت ان کی ہم نوا ہو

سیفٹی ریزر

جو تم نے داڑھیاں ناخن کرنے کو دیے تھے
 اپنے کار منصبی سے منحرف ہیں
 داڑھیاں ناخن بڑھائے جا رہے ہیں
 تم اپنے کاغذی شہروں میں یہ اعلان کر دو
 وحشیوں کی فوج ان کی تاک میں بے

(۱۹۷۹)

اکیلے خطرناک
لوگوں کا جمگھٹ

اکیلے
خطرناک
لوگوں کا جمگھٹ
ہر اک سمت میں
سکہ رانجِ الوقت ڈھونڈا کیا
شہر کی ہر عمارت کھنگالی گئی
ورستی
اور ایوان شاہی
بنے فیشنوں کی دکاں
لا بہر ریسی
بڑے چائے گھر
اجتمائی عبادت گھروں
اور اجابت گھروں میں
کہیں سکہ رانجِ الوقت انہیں ہاتھ آیا نہیں
ناشماروں میں ہے

اب
اکیلے
خطرناک لوگوں کا جمگھٹ
یہ صدیوں کے الفاظ سے پیچھے موڑے
خموشی کے شعلے اٹھائے
کہدھر جا رہا ہے

دودھ کی نہر

پھر خدا

دودھ کی اک نئی نہر کے واسطے

اپنے کہسار پر پل پڑا

آسمانوں سے

پتھر

لڑ کھتے چلے آرہے ہیں

زمیں

اے زمیں

اپنے دست دعا کھول دے

کر دہنا کر دہ سارے ثوابوں کی فہرست کی ڈھال کر

اپنی ساری بزرگ اور خوش روح انفاس کو

شامیانہ بنانا

گڑ گڑاتے ہوئے عرض کر

اے خدا! قہر کی دوڑ کو کھینچ لے، اک ذرا ڈھیل دے

عہد کرتی ہوں میں

اب ترے شیر خواروں پے کوئی مصیبت نہ ہو گی

تری خلق پر کوئی ہبیت نہ ہو گی

سورج بجھنا چاہتا ہے
 اک عمر بے فیض کی
 محنت اور پشیمانی سے
 بوڑھا سورج بجھنا چاہتا ہے
 اس کے وجود کے آنسو اس کوڈا نہتے ہیں
 کیوں جلتے رہے
 کیوں اپنی پناہ کو بھولے رہے
 اپنے کنبے کو پالنے میں کیوں اپنار زق حرام کیا
 اب سیارے بھی جوان ہوئے
 سب نورونا رکاس رہا یا
 اب واپس لو
 اب ٹھنڈے ہو آرام کرو
 اپنے اندر کے پانی سے
 اب سورج بجھنا چاہتا ہے
 یہ غل ہے نظامِ سماں میں
 اب کشش ثقلِ زوال پھے ہے
 سارے سیارے سہے ہوئے
 اب چاروں سمتِ ہبیب خلاوں کو دیکھتے ہیں
 بس دیکھتے ہیں
 اب ڈور کئی تب ڈور کئی

فساد زدہ شہر

اے خدا یے بود و نبود
 فساد زدہ شہر میں
 انسانوں کے قتل کا انتقام
 میں کس سے لوں؟
 ہابیل اور قابیل میں
 کس کا ساتھ دوں
 دونوں ہی مہذب، دونوں ہم شکل
 گھروں میں نچے عورتیں، مرد بے ضرر
 تمہاری کتابوں کے زرہ بکتروں میں
 دبکے بیٹھے ہیں
 تو پھر باہر سڑکوں پر
 خون کی رزمیہ کس نے لکھی؟
 کرفیو لگا ہے
 مسلح افواج کے سہارے
 دنیا میں حکومت کب تک چلے گی
 اے زمینی صد اوں کے سامع از لی
 کیا تو سنتا ہے

میں رونا چاہتا ہوں

ز میں کی گلوگیر آہ وزاریاں
تیری نصر تمیں کہاں ہیں؟
کہاں ہیں ابا بیلوں کے بے پناہ بادل؟
بلا خیز سیلا ب، وحشت خیز ہوا میں پا گل
ادھر جلتے ہوئے مکان
قا تلوں کے نر نغے میں پھنسی ہوئی خلقت
کہاں گئے تیری رحمتوں کے دعاوی؟
اے جی و قیوم مالک!
خواب اور بیداری کے وحدہ لا شریک!
حد ہو چکی ہے
اب تو ہمارے ہاتھوں سے ہتھیار چھین لے
نور کے دروازے کھول دے بے دریغ
معبدوں کو معبدوں سے رہا کر
رہا کر نیکی اور بدی کو
دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے

رات کا مکر

مسجدوں میں اذانیں ہوئیں
 مندروں میں صد اگھٹیوں کی ہوتی
 رات کے مکرنے پھر اشارہ کیا
 چاند و پیکروں میں بٹا
 خوشبوئیں
 پھول پھل، پیڑ پودے
 پہاڑ اور دریا بٹے
 پھر ہوا بٹ گئی
 گیت صدیوں پرانے بردہ کے ملن کے
 وہ سنگیت محظب کی انجمن کے
 سبھی موسموں کی ردائیں
 ہری لال پیلی
 شعائیں بٹیں
 سب دھند لکے، سبھی صاف شفاف منظر بٹے
 پھر صفائیں بٹ گئیں
 رات کے مکرنے پھر اشارہ کیا
 پھر ہوا تیز ہونے لگی اور تیز اور تیز
 آسمان ایک جانب کھلا

میں رونا چاہتا ہوں

تیز رفتار گھوڑوں کی ٹاپیں اڑیں

دوسری سمت سے

تیز رفتار گھوڑوں کی ٹاپیں اڑیں

پھر کھڑے کھیت گیہوں کے جلنے لگے

پھر ہوا حتم گئی

اور کسی نے نہ دیکھا کہ

کوئی مر آہی نہیں

صرف گیہوں جلا

اور جلتے ہوئے کھیت سے ایک لا شہ برآمد ہوا

صحیح کے سارے اخبار کے آخری

کالموں میں

خبر غیر اہم سی چھپی

شہر میں رات بھر کوئی ہلچل نہ تھی

صرف تاریخ کی چند یادیں جلائی گئیں

دونوں ہندو مسلمان محفوظ ہیں

ہاں! کسی موڑ پر ایک رہ گیا

آدمی مر گیا

ازل موسموں کا یہ چھتنار گھیرا
 بہت تیز تیکھی بڑی سرخ گہری ہوا
 تیز تر سائیں سائیں
 ہوا
 تیز تر
 میرے چاروں طرف
 گھومتی ہے
 یہ دنیا کا گولا
 ابلتا ہوا سرخ شعلہ
 خلاوں سے لڑتا
 ازل موسموں کا یہ چھتنار گھیرا
 کہ جس کے تلے
 سب خلاوں سے محفوظ بکے پڑے ہیں
 یہ ٹوٹا ہوا سائبائی سہی
 وہم کا یہ مکان
 اب گراتب گرا
 لڑکھرانے لگا ہے
 ازل موسموں کا یہ چھتنار گھیرا

میں رونا چاہتا ہوں

کہ اب تیز تیکھی بڑی سر جگہ ری ہوا

تیز تر تیز تر

میرے چاروں طرف

گھومتی جا رہی ہے

(۱۹۷۹)

پُر امن آدمی

تم سمجھتے ہو

اب دنیا میں مجزے نہیں ہوتے!

وہ دیکھو!

پُر امن آدمی، تھکا ہوا کمزور

سبریوں کا تھیلا

ہموار قدموں سے گھر جا رہا ہے

اچھے اچھے خیالوں سا

خون کتنے آرام سے بہہ رہا ہے، بے تکلف

زندہ رہنے کا پختہ یقین، مطمئن، محفوظ

(بُنسی خوشی گزار دو بھائی! یہ وقت وہ نہیں کہ

اپنے ہونے کی ضد کرو، جو ملے قبول کرو، دن میں ایک بار

اوپروا لے کا نام لو، سب کچھ سہتے رہو)

”سلام و علیکم“

رام، رام

کشل منگل، آپ کی دعائیں

کیا کیا خرید لائے، دیکھوں؟

کیا مطلب؟“

میں رونا چاہتا ہوں
اور، وہ یکھو! جادو
سنبز یوں کے تھیلے کی قلب ماہیت
ہمواری، اطمینان، امن محروم
وہ مار رہا ہے، دوسرًا اس کو مار رہا ہے
سب ایک دوسرے کو مار رہے ہیں
خون کی دھاریں آزاد ہو گئیں
کتنا طاقت ور ہے
پر امن آدمی
اب کبھی گھر نہیں جائے گا

(۱۹۷۹)

شادی شدہ شہر

ہوس کار آنکھیں
 کے ڈھونڈتی ہیں
 سبھی عورتیں شہر کی
 متقی ہو گئیں

 گھر سے بازار تک
 کوئی اندر ٹھیک گھنچ گئی
 اب کوئی سر برہنہ نہیں
 خواہشیں را ہبہ ہو گئیں
 ایک کچڑ زدہ دارہ

 جس میں انسان جیسے ہیوں لے
 ارادہ تھی

 خشت و آہن کے محلول سے
 بدبوؤں کی عمارت بناتے رہے
 ہڈیاں چھپتی ہیں
 کہ توڑے گئے

 گوشت آواز دیتا ہے چربی جلی
 دانت سے دانت بجھتے ہیں

میں رونا چاہتا ہوں
 اور ہو نئھ سے ہو نئھ کٹ جاتے ہیں
 وہ عبارت لکھی جا چکی
 جس کو پڑھنا ہے، تعییل کرنا ہے
 اور بولنا موت ہے
 جسم کے سارے قوسِ فرج
 گوشت کی چاندنی
 ہڈیوں کے سقفِ بام و محرابِ دور
 خون کی روشنی
 سب پہ اک ازدواجی تھکن چھاگئی
 ایسے شادی شدہ شہر میں
 یہ بوس کار آنکھیں
 کسے ڈھونڈتی ہیں

(۱۹۷۹)

آدمی

تاریک کو ٹھرمی میں

وہ داخل ہوئے

روشن ستارے

”نام“

والد کا نام *

”علاقہ، مذہب“

تعلیم

کار و بار“

کسی کونے سے بلکل سی آواز آئی

”آدمی“

روشن ستاروں پر سنا طاری ہوا

”تلائشی لو! سپاہیو! تلائشی لو“

”صاحب! یہ تو مرد ہے“

بلی گھنٹی کھول رہی ہے

آج عوامی شام سجا میں
بلی نے اپنا شاکا باری ہونا اعلان کیا
کل وہ اپنے پیروں میں
گھنٹی بندھوانے آئے گی
گھنٹی باندھ کے سارے چوبے
بھنگ چڑھا کر لیت گئے
بھنگ میں ایک پرانا ظلم ادارہ ہے
بلی اس کی سرگاری رقاصلہ ہے
ناقوسوں کی جو گیا دھن میں
بھلکتی کی سخنڈائی اوڑھے
چوہوں پر گیانی دھیانی ساتھ ہے
بلی گھنٹی کھول رہی ہے

فرحت احساں (فرحت اللہ خاں) 1952ء میں یوپی کے شہر بہراچ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ اور پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے ایم اے (انگریزی) اور ایم اے (اسلامیات) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ایک عرصے تک آزادانہ صحافت کرنے کے بعد وہ اردو روزنامہ 'قومی آواز'، نئی دہلی سے وابستہ ہوئے اور اس کے ادبی ضمیمے کے نگران کی حیثیت سے تخلیقی صحافت کو فروغ دیا۔ 1998ء سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہونے والے علمی و تحقیقی رسائل 'اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج' (انگریزی) اور 'اسلام اور عصر جدید' کی ادارت سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے شاعری کے علاوہ سماجی، ثقافتی، سیاسی اور تہذیبی معاملات اور قومی و میں اقوامی انسانی صورت حال پر وسیع تر انسانی اور تہذیبی سر و کار کے ساتھ تقریباً ڈھائی سو سے زیادہ مضمایں لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک طویل عرصے سے آل انڈیا ریڈیو کے لیے حالات حاضرہ پر تبصرے، تجزیے اور فیچر بھی لکھتے رہے ہیں۔ انہوں نے دستاویزی فلموں اور ٹی وی سیریلیوں کے اسکرپٹ بھی تحریر کیے ہیں۔

Main Rona Chahta Hoon (Urdu)

ISBN 81-260-1593-4

Rs. 50

